

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

آمنہ اقبال احمد

READING
Section

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

انتساب

اپنے
اکھوتے بیٹے
خرم
کے نام
جو مجھے
اپنی جان سے زیادہ
عزیز ہے

سب تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں۔

2006ء

ارسلان بک کارپوریشن

نام کتاب _____ اکیلا
مصنفہ _____ اشفاق احمد
کمپوزنگ _____ سید اویس قرنی جنگلی سٹریٹ قصہ خوانی پشاور
مطبع _____ آصف نیسین پریس، لاہور
تعداد _____ 600
قیمت _____ 150/- روپے

اشفاق

طیبنہ بکسٹال
پبلسٹریز اینڈ بک سیلز
Ph. 7320318
0301-4072442
المسجد غزنی سٹریٹ ماروہ ہانڈالا، لاہور پاکستان

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

انتساب

اپنے
اکلوتے بیٹے
خرم
کے نام
جو مجھے
اپنی جان سے زیادہ
عزیز ہے

سب تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں۔

2006ء

ارسلان بک کارپوریشن

نام کتاب _____ اکیلا

مصنفہ _____ اشفاقان احمد

کمپوزنگ _____ سید اویس قرنی جنگل سٹریٹ قصہ خوانی پشاور

مطبع _____ آصف پبلیشنگ پریس، لاہور

تعداد _____ 600

قیمت _____ 150/- روپے

اشفاق

طیبہ بکسٹال
پبلسٹائزنگ ہاؤس
Ph.7320318
0301-4072442
انٹرنیشنل سٹریٹ اردو بازار لاہور پاکستان

”آپ اپنی سوتیلی بہن کے قتل کے الزام سے بری ہو گئے ہیں آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“

”آپ یورپ سے آئے، آتے ہی اپنے والد کا وصیت نامہ دیکھنے کے دو دن بعد ہی آپکی بہن سمینہ کا قتل ہوا۔ اس میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”آپ اس ملک کے نامی گرامی شخصیت ہیں کیا یہ قتل کا الزام آپکی شہرت کو بدنام کرنے کی سازش تو نہیں؟“

کورٹ سے باہر نکل کر صحافیوں اور لوگوں کے ہجوم کو چیرتا وہ اپنی بڑی سی سیاہ قیمتی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کیمروں کی چکاچوند میں اس سے مختلف سوالات پوچھے جا رہے تھے۔ اسکے چہرے پر تحسک تھی، الجھن تھی، بیزاری تھی۔

”کیا آپ نے واقعی یہ قتل نہیں کیا؟“ یہ ایک نسوانی آواز تھی۔ طنز اور حقارت لئے۔ ”کیا واقعی آپ بے گناہ ہیں یا آپکی بے پناہ دولت آپکو بے گناہ ثابت کرنے میں معاون ہوئی ہے؟“ اسکا شو فراس کیلئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولے اسکا منظر کھڑا تھا۔

”آپکی چپ کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ یہ قتل آپ نے ہی کیا ہے۔“ وہی آواز تھی۔ زہرا گلتے ہوئے گاڑی تک اسکا پیچھا کر رہی تھی۔

اور وہ شاید مزید برداشت نہ کر سکا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر ہی اسے بازو سے پرے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ کر گاڑی میں جا بیٹھا۔

پچ دتا ب کھاتی دھنک اسکی گاڑی کے پیچھے لگے نمبر پلیٹ کو کھتی رہ گئی۔

کئی مہینے سے وہ اس کیس کی کارروائی نوٹ کر رہی تھی۔ بلکہ وہ خود ہر دفعہ کورٹ جاتی۔

’وہم گماں سے دور دور یقین کی حد کے پاس پاس
دل کو بھرم یہ ہو گیا ان کو ہم سے پیار ہے‘

جج نے مسٹر عالم کو کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملنے پر بری کر دیا تھا۔ ہونہا اس نے کروٹ بدلی۔
ثبوت ٹھوس نہ سہی، مسٹر ظفر عالم کی بے پناہ دولت ضرور ٹھوس تھی۔ جس نے قانون تک کو خرید
لیا تھا۔

اسے پورا یقین تھا وہ ہی قاتل تھا۔ باپ کے وصیت نامے کے مطابق کروڑوں اربوں کی
املاک میں وہ اپنی سوتیلی بہن کو شریک نہ دیکھ سکتا تھا۔ دو ہی دن بعد اسے قتل کر دیا۔ چاقو سے۔
یہ الگ بات تھی کہ اسکے لنگر پرش چاقو پر موجود نہیں تھے۔ اتنا ہی قوف وہ لگ بھی نہیں رہا تھا
کہ پرش چھوڑتا۔

لبے قد، چوڑے شانے، پرکشش نقوش اور ذہین آنکھوں والے تیس بیس سالہ اس
فحص سے اسے نفرت ہو گئی تھی۔ کسی کی زندگی کی اسکی نظروں میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ اسے
معلوم تھا اسکی دولت قانون کو خرید لے گی۔

وہ ایک جرنلسٹ تھی۔ ایک ہفتہ وار میگزین 'آئینہ' کی رپورٹر تھی۔ جو اپنی صاف ستھری
صحافت اور دلچسپ اشاعت کیلئے مشہور تھا۔

جھکے جھکے سے قدم اٹھاتی کندھے سے بیک لٹکائے وہ بس سٹاپ پر آکھڑی ہوئی۔
وہ ایک عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ والد دوسرے شہر میں یونیورسٹی میں انگلش
ڈیپارٹمنٹ کے چیرمین تھے۔ والدہ بھی وہیں سائیکولوجی کی پروفیسر تھیں۔ دو بہنیں اور تھیں۔
ابھی پڑھ رہی تھیں۔ ایک بی اے کے آخری سال میں دوسری ایف اے کر چکی تھی۔ بھائی کوئی
نہیں تھا۔ صنف خود یہاں ایک لڑکی فرزانہ کیساتھ ایک چھوٹے سے صاف ستھرے دو بیڈروم
کے فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ فرزانہ مقامی کالج میں لیکچرر تھی۔ ابھی لڑکی تھی۔ دونوں میں خاصی
بے تعلق تھی۔

سوجھ میں کوئی وہ بس میں جا بیٹھی۔ یہ بس سیدھی ان فلیٹس کے آگے سے گزرتی تھی
جہاں صنف تمام پڑھ رہی تھی۔ گیٹ پر اتر کر وہ جلدی جلدی فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
فرزانہ ابھی نہیں آئی تھی۔ کچن میں ہی چند نوالے لے کر وہ اپنے بیڈروم میں آئی اور بستر
کا پڑھی۔ آکھیں سو کر سونے کی کوشش کی مگر۔ بے سود۔ وہ رہ کر اسکے ذہن میں کورٹ
کی آج کی کارروائی گھوم رہی تھی۔

سوسائٹی
کام

”تو ہونے دو۔ ہمیں کیا۔“

”نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔“

”تو پھر کیا ہوگا؟“ وہ مسکرایا۔

”اسے اندر ہونا چاہیے۔ پھانسی لٹنی چاہیے یا مر قید۔ گل سڑ جائے جیل کے اندر ہی۔“ وہ حقارت سے کہہ رہی تھی۔

”تم کیوں اسکے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہو۔ کورٹ نے فیصلہ دے دیا بس دے دیا۔ ضروری ہے بہن قتل ہوئی تو بھائی بھی ختم ہو۔ کہاں کا انصاف ہے یہ۔“ وہ اسے چراتے ہوئے بولا۔

”انصاف!“ وہ جیسے خود سے بولی۔ ”انصاف تو ہونا ہی چاہیے۔“ اس نے اپنے کاغذ تہہ کئے، بیگ میں رکھے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”کام ہے ذرا۔“

وہ سیدھی ادھیڑ عمر چیف ایڈیٹر اشفاق صاحب کے آفس میں آگئی۔ اشفاق صاحب اور دھنگ کے ابوریاض احمد پڑھائی کے دوران ایک ہی ہوٹل میں رہتے تھے۔ بڑی دوستی تھی آپس میں۔ بعد میں اشفاق صاحب نے صحافت سنبھال لی اور اسکے ابو کالج میں لیکچرر ہو گئے۔ وقت گزرتا رہا۔ دونوں کو تھے الگ الگ شہروں میں مگر دوستی میں فرق نہیں آیا۔ اب بھی آتے جاتے تھے۔ اب بھی ملنا جلتا تھا۔ بلکہ اشفاق صاحب کے ہی سہارے تو انہوں نے دھنگ کو جرنلسٹ بننے اور انکے پاس کام کرنے کی اجازت دی تھی۔ ورنہ نہ ابو اس پیشے کے حق میں تھے اور نہ ہی اشفاق صاحب۔

ابو تو اسکی ضد کے آگے مجبور ہو گئے۔ مگر اشفاق صاحب اکثر مشورہ دیتے۔

”میری ماٹو بیٹی تو گھر سا داپنا۔ شادی کر لو۔ یہ جان جو کھوں کے کام تمہارے بس کے نہیں۔“ وہ بہت خوبصورت تھی۔ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں بہت چھوٹک چھوٹک کر قدم رکھنا

اگلے روز وہ اپنی معمول کی ڈیوٹی میں گن تھی۔ ڈیسک پر بیٹھی ایک رپورٹ کے کاغذات کو ترتیب دے رہی تھی۔ کہ اسکا ساتھی رپورٹر آصف آ پہنچا۔

”ہیلو دھنگ۔“ وہ خوشدلی سے بولا۔

”ہیلو۔“ اسکی نظریں اب بھی کاغذات پر تھیں۔

”کچھ پتہ بھی ہے تمہارا دشمن کونج کر گیا ہے اس شہر سے۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے چونک کر ساٹھایا۔

”مسٹر فخر عالم کل شام اپنا یہاں والا پولیس چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں کہیں چلا گیا ہے۔“

”کہیں چلا گیا ہے؟“ اسکی آواز میں حیرت تھی، پھیلی پھیلی آنکھیں شکوک کی غماز۔

”ہاں۔“ لا پرواہی سے کہتا ڈیسک پر بیٹھے ہوئے وہ اپنا بیگ کھولنے لگا۔

”آصف۔“

”ہوں۔“ اسکی نظریں اپنے کام پر تھیں۔

”مسٹر فخر عالم کیا نہیں فرما رہا ہے۔“ وہ پورے وثوق سے بولی۔

”کیا مطلب؟“

”کورٹ میں وہ میری ضرور ہوا ہے۔ مگر کورٹ سے باہر سب کا ایک ہی رد عمل تھا۔ ایک عیبات تھی ہرزبان پر۔“

”کیا؟“ وہ اب بھی کوئی خاص توجہ نہیں دے رہا تھا اسکی بات کو۔

”کسا ہٹی بہن کا قتل ہی نے کیا ہے۔ پیسے کی بدولت چھوٹ گیا ہے۔“

”پولیس۔ قانون کا کام ہے یہ۔“

”صرف پولیس یا قانون کا نہیں ہمارا بھی ہے۔ باہر کے ممالک میں تو رپورٹرز بعض وقت پولیس سے زیادہ سرگرمی دکھاتے ہیں۔ زیادہ کھوج میں رہتے ہیں بلکہ پولیس کا کام ہو جاتی ہے اور پولیس کامیاب رہتی ہے۔ پولیس، قانون سب کو مل کر کام کرنا چاہیے۔ پولیس کا تعاون تو بہت Count کرتا ہے...“

”اچھا بابا اچھا۔“ وہ لا جواب سے ہو گئے۔ ”لیکن۔ کسی میل جرنلسٹ پر چھوڑ دو یہ کام۔“ انہوں نے مشورہ دیا۔

”میل جرنلسٹس کیا مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“ اسے انکی بات سے اتفاق نہیں تھا۔

”اسکی بات نہیں ہے۔“

وہ اسکی ذہانت، اسکی قابلیت کے قائل تھے۔ وہ جینٹلمین تھے وہ جانتے تھے۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے اسے جو بھی اسٹیمینٹ ملی تھی، نہایت خوبی سے انجام دی تھی۔ News sense تھا اس میں۔ ایکٹو تھی مگر۔

پچھلے دنوں اسکے ابو سے ملے تھے تو ایک بار پھر انہوں نے انہیں دھنک کو شادی پر مائل کرنے کا کہا تھا۔ جرنلزم اسکا شوق تھا پڑھ چکی تھی مگر وہ اسکی جاب کے خلاف تھے۔ وہ ٹیچنگ وغیرہ کرتی تو انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر یہ کام۔ وہ پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ کسی طرح دل نہیں مانتا تھا۔ پھر وہ لڑکی کی بروقت شادی کے حق میں تھے۔ آجکل اس کے رشتے بھی آرہے تھے۔ بعد میں شاید ایسا نہ ہوتا۔ دو بیٹیں اور بھی تھیں، جوان تھیں وہ بھی، دھنک کی شادی ہو جاتی تو ان کیلئے بھی رستہ کھل جاتا۔

”بیٹی۔ میری مانو تو شادی کر لو۔ تمہارے ابو کی بھی یہی خواہش ہے۔“ وہ ایک قائل پر نظر سے جمانے آہستہ سے بولے۔

وہ جس بھی نظر آنے لگی۔

”شادی کیلئے کافی وقت پڑا ہے نائل۔“ وہ کچھ جھنجھلائی سی بولی۔

پڑتا ہے۔ معزز اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ باپ کا دوست ہونے کے ناطے انہیں اسکی فکر بہر حال رہتی تھی۔ صحافت میں کہاں کہاں بھٹکنا پڑتا تھا۔ کسی کو سنا میں تو کسی کی سنی بھی پڑتی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دھنک کسی غلط تجربے سے دوچار ہو۔

”کیا بات ہے بیٹی۔“ اشفاق صاحب اسے متفکر سادیکہ کر خود ہی گویا ہوئے۔

”انگل... سنا ہے مسز فخر عالم یہاں سے کہیں اور چلا گیا ہے...“

”وہی۔ اس مرڈر کیس والا؟“

”جی ہاں نے قدرے توقف کیا۔“ وہ جب سے یورپ سے آیا تھا۔ یہیں رہ رہا

تھا۔ بہت بڑا کاروبار ہے اسکا یہاں۔ یوں اچانک راتوں رات بغیر کسی کو پتہ چلے چل دینا کیا گٹ کی نشاندہی نہیں کرتا؟“

”تو؟“ وہ اب بھی اُسکے کام میں دلچسپی لینے اور معرکہ آرائی کے شوق پر دھیرے سے مگراتے ہوئے بولے۔

وہ چند لمبے کچھ سوچتی رہی۔ پھر آہستہ سے سراٹھایا۔

”انگل میں اس آدمی کا پتہ لگانا چاہتی ہوں۔ میں۔ اور پھر تقریباً سبھی لوگ اس کیس کے فیصلے سے مطمئن نہیں۔ اسکا یوں آسانی سے بری ہو جانا سب کو عجیب لگ رہا ہے اور۔ میرے لئے تو۔ ایک چیلنج ہے جیسے۔“

انگل آہستہ سے مگراوئے۔

”بیٹی یہ کام اتنا آسان نہیں۔ پچھلے کئی مہینوں سے ہم لوگوں نے کتنی کوشش کی اسکا اعتراف لینے کی۔ مگر صاف جواب مل جاتا تھا کہ وہ کسی کو اعتراف نہیں دیا...“

”میں کرونگی اسکا اعتراف۔“ وہ انکی بات کاٹنے ہوئے جھگڑت سے بولی۔ اسے یقین تھا مسز فخر عالم نے اسے دیکھا نہیں تھا۔

”مشکل ہے۔“

”تو نائل یہ مشکل کا ماہ خزون کر گیا۔“ وہ اب بھی مگنی۔

میں لٹکایا، کپڑے تبدیل کئے، فرج سے کھانا نکال کر گرم کیا، فرزند کا انتظار کئے بغیر ہی کھانا کھایا اور تھکی تھکی سی بستر پر لیٹ رہی۔

آنکھیں موندتے ہوئے وہ اس مہم کے مختلف پہلوؤں پر سوچنے لگی۔

فخر عالم کا گھر جسے وہ طنزیہ لہجے میں اسکا محل کہا کرتی تھی اسے معلوم تھا۔ شہر کے مضافات میں بنا اسکا گھر واقعی کسی محل سے مشابہ تھا۔ سب سے پہلے تو وہ وہاں جانتی۔ کسی بھی طرح معلوم کر گئی کہ وہ کہاں گیا ہے۔ اگر وہ چھپ کر گیا ہوگا تو وہاں موجود نوکروں کو بھی ظاہر ہے نہیں بتایا ہوگا۔ بہر حال۔۔۔ وہ ہر ممکن کوشش کر گئی اس مسئلے کو سلجھانے کی!

کسی خوش آئند تصویر سے اسکی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ وہ دن کتنا خوبصورت ہوگا جب وہ مسٹر فخر عالم کو بے نقاب کرے گی۔ پبلک کو دھماکہ خیز انکشاف مہیا کر گئی اور۔۔۔ اور اسکا کتنا نام ہوگا!

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ شام کے چارج رہے تھے۔ سردیوں کا آغاز تھا۔ دن گھنٹے لگے تھے۔ وہ فوراً اٹھی۔ وہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ ہی مسٹر فخر عالم کے سراغ میں تھی۔ ہو سکتا تھا کسی اور اخبار کسی اور میگزین کا رپورٹر بھی اسی کوشش میں لگا ہو۔ اور یہ۔۔۔ اس نے ہرگز ہرگز نہیں ہونے دینا تھا۔

اس نے الماری میں سے بیٹنگر میں لٹکا اپنا ڈال گرین پرسفید سفید پھولوں والا ڈریس نکال کر پہنا۔ ڈال گرین ہی دوپٹہ گلے میں ڈالا۔ کمر کو چھوتے اپنے گھنے سٹریٹ ہنی براؤن بالوں میں برش کیا۔ لیڈر کے بیج شوز پہنے اور جینڈ بیگ کندھے سے لٹکاتی فلیٹ کو تالا لگا کر جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگی۔

شام سیندوری ہو رہی تھی، ہوا بخ بستہ، تھکا تھکا یا سورج دن بھر کی مسافت کے بعد دور پہاڑ کے اس پار پناہ ڈھونڈنے جا رہا تھا اور۔۔۔ شام کیساتھ کائنات کا ذرہ ذرہ سیندوری رنگ میں رنگا جا رہا تھا۔

”یہی تو وقت لٹکا جا رہا ہے۔“ وہ نامحاذ انداز میں بولے۔

”اچھا آپ یہ تو کام کر لینے دیں۔ اسکی تو اجازت دے دیں۔ پھر دیکھا جائیگا۔۔۔“

”یہ بہت مشکل کام ہے۔ بہت جان جوکھوں والا۔ تم کہاں کہاں بھٹک لو گی۔ کل کو خدا نخواستہ

کوئی بات ہوئی تو ریاض احمد کو کیا جواب دوں گا۔۔۔“

”کچھ نہیں ہوگا انکل۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔“ وہ مسکرائے۔

”اچھا چلیں۔ کوئی مشکل پیش آئی تو واپس آ جاؤ گی۔ اور پھر میں یہاں پر وگرنس رپورٹ

بھی تو دیتی رہوں گی۔“

اشفاق صاحب نے گہری سانس لی۔ جیسے ہار مان لی ہو۔

”ٹھیک ہے۔ میں چیف رپورٹر سے بات کرتا ہوں۔ تم ان سے ملتے ہوئے جانا۔ وہ

تمہارے وہاں جانے اور ٹی اے ڈی اے وغیرہ کا بندوبست کر دیں گے۔ اور ہاں۔ یہ تو بتاؤ اسکا

پتہ کیسے چلاؤ گی۔ کہاں گیا ہے؟ کس طرف نکلا ہے؟ تم کس چیز سے سفر کرو گی؟“ انہوں نے

پریشانی سے سر ہلایا۔ ”مشکل میں ڈال دیا ہے تم نے۔ ہمارے ملک میں فیملی صحافت ابھی

اتنی ایڈوانس نہیں ہوئی۔۔۔ کہ اکیلے میں گھومتی پھریں۔“ وہ قدرے رکے۔ ”تم ایسا کرو

آصف کو ساتھ لے لو۔ انہوں نے فون کارڈ سیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ اتنی چھوٹی موٹی بھی نہیں تھی۔ کہ اکیلے سفر نہ کر پاتی۔ وہ آصف کو بالکل ساتھ نہیں لے

گی۔ وہ تو پہلے ہی اس بات کے خلاف تھا۔ بلکہ سرے سے مسٹر فخر عالم کو مجرم گردانتا ہی نہیں تھا۔

کوئی بہانہ کر کے وہ آصف کو پیچھے چھوڑ جائیگی۔ آصف نے رکاوٹ ہی بنانا تھا اور کچھ نہیں۔

”ٹھیک ہے انکل۔ سو ناٹیس آف یو۔“

اور۔۔۔ آفس سے نکل کر چیف رپورٹر کے دفتر کی طرف بیڑھی۔

خوش ذوقی سے بچے اپنے منے سے آرام دہ فلیٹ میں آ کر اس نے اپنا جینڈ بیگ الماری

دھنک کے شکوک یقین میں بدلنے لگے۔ اگر وہ فرار نہیں ہوا تھا تو اپنے ملازم خاص کو بتا کر جاتا۔

”جب کہیں جاتے ہیں تو آپکو بتا کر جاتے ہیں؟“ وہ خالص رپورٹوں والے انداز میں اپنے یقین کے تصدیق کیلئے پوچھنے لگی۔
”جی ہاں“۔ وہ مختصر ابولا۔

اور۔۔۔ دور سے اسے مرمریں ستونوں والے عمرانی برآمدے میں سے گزرتی ایک ادھیڑ عمر عورت دکھائی دی۔

صاف ستمرے کپڑے پہنے، بالوں کا جوڑا بنائے ہر پر سفید شفاف دوپٹہ لٹے، یہ خاتون ہی شاید اسے کچھ بتا پاتی۔
دھنک آگے بڑھی۔

اور ملازم خاص ایک نظرا سے دیکھتا، دھیرے سے مسکراتا دوسری طرف چل دیا۔ اسکی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اسے اپنے مالک کے متعلق معلوم تھا کہ وہ کہاں گیا تھا مگر بتا نہیں رہا تھا۔ جیسے اسے نہ بتانے کی تاکید کی گئی تھی۔

”آداب“۔ جانے کیوں دھنک کو یہ خاتون اچھی سی لگیں۔
اسکے سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ اپنا نظر کا چشمہ اتار کر اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے دوبارہ چشمہ پہننے لگیں۔

”آؤ بیٹی اندر آؤ“۔ وہ بہت شفقت سے کہنے لگیں۔
”شکر یہ آئی۔ مگر میں اندر نہیں آسکتی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں نے... مسز فخر عالم کا پتہ کرنا تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔“

اور فخر عالم کی ہاؤس کیپر۔ ایک بار پھر اسے سر سے پاؤں تک پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائے لگیں۔

”اچھا تو وہ تم ہو جس کیساتھ وہ فون پر کتنی کتنی دیر باتیں کرتا رہتا ہے۔ اچھا ہوا بیٹی تم خود

یہی کا کرنا یاد آ کر کے وہ آگے بڑھی۔
سفید سنگ مرمر سے مزین وسیع و عریض کونٹھی، اسکی عمر انیس، اونچے اونچے مرمریں ستون اور گہرے سرخ پھولوں سے لدی بالکدیاں، واقعی کسی محل کا نمونہ تھیں۔

مچٹ پر کھڑے مسلح چوکیدار نے اسے آسانی سے اندر جانے دیا۔ تا حد نظر پھیلے وسیع عملیں لان، موسمی پھولوں سے آراستہ رنگ برنگی کھاریاں، نایاب گلابوں کے تختے، جا بجا قبا اور سرو سے لپٹی سرخ اور سفید ننھے ننھے پھولوں کی بلیں۔

قریب کے گیلے میں لگی Kiss Me Quick کی کانٹے دار شاخیں اور ہر شاخ کے سرے پر لگے دو دو پتیوں والے چار چار سرخ پھولوں کے جھرمٹ کو کتنی محفوظ ہوتی وہ آگے بڑھ رہی تھی۔

پھر جیسے وہ چونکی۔ وہ ان نظاروں سے لطف اندوز ہونے نہیں مسز فخر عالم کا پتہ کرنے آئی تھی۔

یکدم ہی اسکے قدم تیز ہو گئے۔ متلاشی نظریں ادھر ادھر ہر جگہ لگیں۔
”میں آپکی کوئی مدد کر سکتا ہوں“۔ جیسے کوئی خاص ملازم تھا، پاس آ کر مودب طریق سے بولا۔

”مسز فخر عالم گھر پر ہیں؟“ وہ جانتے ہوئے بھی پوچھنے لگی۔ شاید نوکروں کا رد عمل دیکھنا چاہتی تھی۔

”جی نہیں۔ وہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔“ اس کا لہجہ کسی بھی جذبے سے عاری تھا۔
”کہاں گئے ہیں؟“
”مجھے نہیں معلوم۔“

”کسی اور ملازم کو بتا کر گئے ہیں۔“
”شاید نہیں۔ ورنہ مجھے ضرور بتا کر جاتے۔“ وہ یقیناً ملازم خاص تھا۔ جواتنے دھوک سے کہہ رہا تھا۔

پھیرا۔

”خدا حافظ“۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

قلیٹ پر آ کر اس نے جلدی جلدی بیگ میں دو جوڑے کپڑے، ہائیٹ سوٹ، جیکٹ، چھوٹا سائپ ریکارڈر، پیڈ چین، پینٹنگ کے برش، پینٹس، غرض بر ضروری چیز ڈالی۔ بیگ کندھے سے لٹکایا، اور بازو پر ہلکا سا کبل لیتے ہوئے اپنی ساتھی فرزانہ کو ضروری کام سے اپنے گھر جانے کا بہانہ بناتے ہوئے تیزی سے قلیٹ سے اتر آئی۔

فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ٹرین چھوٹنے میں صرف چالیس منٹ تھے۔ وہ پریشانی سے ادھر ادھر ٹیکسی کی تلاش میں دیکھ رہی تھی۔ ایک خالی رکشہ پاس سے گزر رہا تھا وہ اسی میں بیٹھ گئی۔

”ریلوے سٹیشن“۔ اپنا شولڈر بیگ اور کبل سیٹ پر رکھتے ہوئے وہ جلدی سے بولی۔ وہ ایک سیکنڈ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اور۔۔۔ نکت خرید کر وہ ٹرین میں چڑھی، اپنا سامان اوپر رکھا اور اپنا ہینڈ بیگ کندھے سے اتار کر اپنے قریب رکھتے ہوئے سیٹ پر بیٹھی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ آج کی پوری رات، کل کا سارا دن اور پھر کل شام کے چھ بجے اس نے وہاں پہنچنا تھا۔

سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کر اس نے تھکی تھکی آنکھیں موند لیں۔ بہت سی سوچوں اور اندیشوں کے ہا وجود اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ جہاں مسٹر فخر عالم کی اسٹیٹ تھی وہیں قریب ہی ایک پہاڑی گاؤں میں اس کی امی کی کلاس فیلو اور دوست ایک پرائمری سکول کی ہیڈ مسٹر لیس تھیں اور دھنک نے سردست وہیں قیام کرنا تھا۔

اس نے اپنے لئے چائے منگوائی۔ اور گھونٹ گھونٹ کر کے پتی چلتی ٹرین میں سے باہر تارکیوں میں گھورتی رہی۔

رات کا کھانا اس نے نہیں کھایا۔ دل نہیں کر رہا تھا۔ ایک گلاس دودھ منگوا کر پیا اور اپنا

اپنے ہاتھوں سے چھوڑا گیا اور وہ وہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ کسی دن وہ کبھی کسی
 دن کو کوئی دن تھا۔۔۔ ”خدا حافظ“۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

خدا حافظ۔ دھنک نے بھی کہا اور۔ واپس گیٹ کی طرف مڑی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کبیل اور پلٹے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

ٹرین سے اس نے قلی سے سامان ٹیکسی میں رکھوایا اور ڈرائیور کو اپنی امی کی دوست آنٹی نور جہان کے گاؤں کا پتہ بتا دیا۔

آنٹی کا گاؤں یہاں سے تقریباً بارہ میل پر تھا۔ ٹرین بھی لیٹ پہنچی تھی۔ ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہوتے پونے سات ہو رہے تھے۔

موسم بدل چکا تھا۔ بلکہ یہاں تو خاصی سردی تھی۔ دن قدرے چھوٹے اور شامیں تو وہاں بھی سب سے ہو چلی تھیں مگر۔

یہاں تو جیسے دنیا ہی اور تھی۔ چکر دار سڑک کے ایک طرف پانی اور دوسری طرف پہاڑ پر اونچے قد آور درختوں کا تاحہ نظر پھیلا جنگل نظر آ رہا تھا۔ بگلہ سے سفید بادل درختوں میں تیر رہے تھے اور۔ کہراتی زیادہ تھی کہ چلنا دشوار ہو رہا تھا۔

شام کی سیاہیاں اترنے لگی تھیں۔ سردی بڑھ گئی تھی اور ٹپ ٹپ بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ چوٹی پر پہنچ کر کہیں آنٹی کا چھوٹا سا سکول اور گھر دکھائی دیئے۔ ٹیکسی کا کرایہ ہوا کرتے ہوئے اس نے سامان اتروایا اور آگے بڑھتے ہوئے نگڑی کے چھوٹے سے برآمدے میں دروازے پر دستک دی۔

وہ پہلے بھی اپنے والدین کیساتھ گرمیاں گزارنے میں آئی تھی، بگلہ کئی بار۔ مل نیشن تھا یہ چھوٹا سا۔ فلیٹ کرائے پر لیکر وہ لوگ سیزن گزارنے اکثر یہاں آتے۔ اور آنٹی اسی گھر میں رہ رہی تھیں۔ یہ انکا آبائی گاؤں اور آبائی گھر تھا جسے انہوں نے کچھ حصہ اپنے لئے رکھ کر باقی میں سکول لیا تھا۔ شاہی کی نہیں تھی بلکہ وہی نہیں بس سکول کھول چلا کر ہی اپنے آکھ مصروف رکھا ہوا تھا۔

اتنا پورا تھا اٹا ہونا سا یہ گھر اور اسے خوبصورت تھے اسکے اطراف کہ جی چاہتا تھا
۔ یہیں بس جاؤ نہیں رہ جاؤ!

آئی اسے بغیر اطلاع کے یوں اچانک دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔

رات کے کھانے کے بعد جو دونوں ایک ہی کمرے میں گرم گرم رضائیوں میں گھر کر
باتوں میں الجھیں تو ایک بج گیا رات کا۔ دنیا جہان کی باتیں ہوئیں مگر —

دھنک نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ یہاں کس مقصد سے آئی تھی۔ بس کہا۔ تھک گئی تھی
بہت۔ چند گھنٹا لے لیں۔ بجائے گھر جانے کے ادھر آنکلی۔ کہ اسے آئی یاد آ رہی تھی
اور پھر۔ ایسے موسم اور ایسے ماحول سے اسے عشق تھا۔ لگے ہاتھوں وہ دو ایک پیننگنگو بھی
بتاتی!

صبح آذان کے وقت اسکی آنکھ کھلی۔ ٹھنڈے تیغ پانی سے اس نے منہ ہاتھ دھوئے۔ اور
نماز کی تیاری کرنے لگی۔

فارغ ہو کر اس نے سفید زمین پر سرخ چپک کی شلوار قمیض پہنی۔ لائیسٹ براؤن خوبصورت
بالوں میں برش کیا اور سفید جوگرز پہن کر سفید مائیک سی جیکٹ پہنتے ہوئے کالراؤ پراٹھایا اور باہر
برآمدے میں آنکلی۔

آئی کے مکان پر سورج کی پہلی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ مگر سامنے دور تک بادلوں کا راج
تھا۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ گہری کھائی، پھر چڑھائی، چیز اور صنوبر کے فلک بوس درخت،
جیسے کچھ تھا ہی نہیں یہاں۔ ہاں دور اس پار۔ ادھر ادھر واقع گھروں کی ٹین کی چھتیں ایک
بار پھر دھوپ میں سنہری ہو رہی تھیں۔

قدرت کس قدر جدت پسند واقع ہوئی تھی!
وہ دیرے سے مسکرا دی۔

چند قدم چلتی وہ مشرقی رخ پر برآمدے کے آخری سرے پر آگئی۔ یہاں تاہموارڈ حلالان
تھی اور نیچے کافی گہرائی پر بہتا، مخصوص شور کرتا دریا تھا۔ دریا میں چاندی کی طرح چمکتا شفاف
پانی بہ رہا تھا۔ اور جگہ جگہ درختوں کے کٹے ہوئے تنے پانی کے بہاؤ پر چلے جا رہے تھے۔
برآمدے کے لکڑی کے کھبے سے سر نیچا اسکی نظرس دریا کے اس پار اونچائی پر چڑھ صنوبر
اور کٹے قد آور درختوں پر گئیں۔

یہ — فخر عالم کے جنگلات تھے۔ اور۔ اس سے بھی آگے کئی کوسوں پر محیط اسکی
اسٹیٹ تھی۔ رات باتوں کے دوران آئی نے اسے اپنے مشرقی پڑوسی کے بارے میں بتایا تھا!

READING
Section

اس نے سر جھٹکا۔ سوچوں سے باہر نکلی۔

کہ اس نے کم سے کم وقت میں بہت سارا کام کرنا تھا!

پچھلے کئی مہینوں سے ہم لوگوں نے کتنی کوشش کی اس کا انٹرویو لینے کی۔ مگر صاف جواب مل جاتا تھا کہ وہ کسی کو انٹرویو نہیں دیگا۔ اسکے کانوں میں انکل اشفاق کے الفاظ گونجنے۔
میں کرونگی اسکا انٹرویو۔ اس نے جواب میں کہا تھا لیکن۔

اب اس نے آئیڈیا بدل لیا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی۔ کہ انٹرویو کیلئے اسے بھی نکالنا جواب مل جاتا تھا۔ سو ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے تھا۔ کہ بغیر انٹرویو کے ہی اس کے تمام حالات اسے پتہ چل جاتے۔ کیسے؟

یہ بڑا میز حاسواں تھا۔ اور۔

وقت کم مقابلہ سخت تھا!

”صبح ہی صبح وہ کبھی کبھی گھوڑے پر سوار پانی کے اس پار اپنے جنگل میں گھومتا نظر آتا ہے۔۔۔“ اسے اچانک آنٹی کی بات یاد آئی۔

اور۔ ہر خیال ذہن سے نکال۔ وہ اندر آگئی۔

آنٹی چھوٹے سے کچن میں تخت پر بیٹھیں نماز کے بعد اب بھی دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے دعا مانگ رہی تھیں۔

دھنک اندر کمرے میں گئی۔ جلدی جلدی اپنے بڑے سے ہینڈ بیگ میں ایک جوڑا کپڑے، چند برش، پینٹس، پیڈ پین اور باقی ضروری اشیاء ڈالیں اور کچن میں آگئی۔

”آنٹی میں چلتی ہوں ذرا۔ دریا اور پار والا جنگل دھوپ کی پہلی کرنوں میں بہت خوبصورت لگ رہے ہیں۔ سو جتنی ہوں تصویر بنانا شروع ہی کر دوں۔“ جو گرز پر جھکتے ہوئے ایک بار پھر بندھے ہوئے تسموں کو کسنے لگی کہ سر اسر جھوٹ بولتے وقت زبان کچھ ساتھ نہ دے پار ہی تھی۔

”اسے جی ٹی ٹی تو کرتی جاؤ۔“ دعا ختم کر کے انہوں نے تخت پر بچھے جا رہا نماز کا کون موڑا

”آنٹی پھر ماحول کی وہ خوبصورتی نہیں رہے گی۔“

”لو بھلا۔ اچھا یہ گرم گرم چائے کا ایک کپ تو چیتی جاؤ۔“

اور آنٹی کے سر پر اس نے چوٹھے پر رکھی کیتلی سے گرم گرم چائے پیالی میں انڈیل لی۔

”اچھا آنٹی جاتی ہوں اب۔“ جلدی جلدی چائے حلق سے اتارتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اگر دیر ہوگئی تو فکر مت کیجئے گا۔ یہیں گرد و نواح میں ٹھہری ہوگی کہیں۔ آ کچھ پتہ ہے

تصویر بنانے میں تو کئی کئی دن بھی لگ جاتے ہیں۔“ اس نے دنوں کا خاص طور سے ذکر کیا۔

کیا پتہ اسے کتنا وقت لگ جاتا۔ آنٹی پریشان ہوئیں پھر۔

اور بیچاری آنٹی نے سوچا صحافت تو ویسے بھی لڑکی کو لڑکا بنا دیتی ہے۔ اور پھر اس نام

بوائے کو تو تصویریں بنانے کا بھی شوق تھا۔ کہیں رہ بھی لیتی تو اپنی حفاظت آپ کرنا جانتی تھی۔

”جیسے تمہاری مرضی بیٹی۔ مگر کام جلدی ختم کرنے کی کوشش کرنا میں انتظار کرونگی۔ ابھی

تو ہم نے ٹھیک سے باتیں بھی نہیں کیں۔“

”اچھا آنٹی۔“ اس نے کہا۔

اور باہر نکل آئی۔ ارد گرد نگاہ دوڑائی۔

دور پر لی طرف دریا کی چوڑائی کافی کم اور بڑے بڑے پتھر زیادہ تھے۔ وہ وہیں سے

دریا عبور کرے گی۔ پر۔

”سنا ہے وہ اپنے علاقے میں کسی اجنبی کو گھسنے نہیں دیتا۔“ آنٹی نے رات یہ بھی تو کہا

تھا۔ پھر؟

اور۔ اسکے ذہن میں جیسے کون سا سال کا۔ ترکیب آئی گئی دماغ میں۔ لیکن۔

اگر قسمت یا اور ہوئی تو وہ نکلا ہوگا گھڑ سواری پرنا!

تیز تیز قدم اٹھاتی وہ ناہموار سر سبز ڈھلانوں پر چلی جا رہی تھی۔ سفید جو گرز، سفید جیکٹ

اور لائیٹ براؤن سٹریٹ بالوں میں سفید ہی بیئر بیٹا سے بہت مصوم بنائے دے رہے تھے۔

اسکا چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے مبرا تھا کہ خدا نے اتنا حسن دے رکھا تھا کہ ضرورت ہی

تھوڑی سی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں سوکھا۔ وہ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں دیئے وہیں پاس کھڑا سے گھور رہا تھا۔

دھنک نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اسکا جواز جواز دکھ رہا تھا۔ نقابت اتنی تھی کہ اٹھ ہی نہ سکی۔

”آپکو بہت چوٹیں آئی ہیں۔ آپکے پاس آکر گرنے پر گھوڑے نے بدحواس ہو کر آپکو زخمی کر دیا ہے۔ آئیے آپکو ڈاکٹر کی مدد چاہیے۔“ اسکا چہرہ پاٹ اور آواز کسی بھی قسم کے جذبے سے عاری تھی۔

وہ جھکا اور دھنک کے کسی قسم کے احتجاج سے پہلے ہی اس نے اسے بڑی آسانی سے اپنے دونوں بازوؤں پر اٹھایا اور قریب کھڑے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

جنگل میں ہی درختوں اور سبزے میں گھرا اسکا لکڑی کا ڈھلانی چھتوں والا گھر بے حد خوبصورت تھا۔

گھر کے نیچے سے ہوتے ہوئے پانی اس طرف ایک آبشار کی شکل میں گر رہا تھا۔ شاید مصنوعی جمیل نکال کر، یہاں تک لا کر اسے آبشار کی شکل دی گئی تھی۔ گھر کے نیچے ہی جمیل

میں دور اس کنارے پر ایک کشتی بندھی نظر آ رہی تھی۔ جمیل کے اوپر اور گھر کے سامنے لکڑی کا ایک جنگل دار چھوٹا ہل بھی گھر کے دائیں اور بائیں اطراف کو ملانے کیلئے بنایا گیا تھا۔ مختصر سے

ہل پر چھوٹا سالیپ پوسٹ بھی نصب تھا۔ ہل کے دائیں اور بائیں طرح طرح کے خوبصورت پھولدار درخت اور خورد و سفید ڈیزائن گھر سے پڑے تھے۔ بائیں جانب پتھروں کی میز صیباں

پودوں اور پھولوں میں چھتی چھپا تھی حسین بلڈنگ تک جاتی تھی۔ ہل کے پیچھے سے لکڑی کا جھونپڑا نما بڑا سا دروازہ مکان دکھائی دیتا تھا۔ چوڑے شیشوں کی چوڑی چوڑی کھڑکیوں

میں کریم کالر کے پردے ایک طرف ہٹائے گئے تھے۔ تمام مکان میں لکڑی کی پونٹنگ ہوئی ہوئی تھی۔ اوپر کی منزل کی ہالکنوں میں سے ان گنت سرخ پھول پھول رہے تھے۔ اور ایسے ہی

سرخ پھولوں کی تیل مکان کی چھت کو یوں گھیرے میں لئے تھی جیسے پھولوں کی چادر ڈال دی

نہ پڑتی تھی۔

دوریا کے جگ سے پرہنج کر وہ ایک ہل کور کی۔ اوپر نگاہ کی۔ گھنے جنگل میں بادلوں نے کھلی چار کھی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اسکے ذہن و دل میں اس وقت چلی تھی۔

وہ بارڈر کر اس کرنے جا رہی تھی۔ جہاں جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ پھر اس جگہ کا مالک ایک قاتل اور سفاک شخص تھا۔ اور وہ بہر حال ایک لڑکی۔

بولڈ ہونے کے باوجود اس وقت دل ایک بار دھڑکا ضرور!

بڑے سے پتھر پر قدم رکھتے وقت اس نے دل ہی دل میں اپنی کامیابی کی دعا مانگی اور اللہ کا نام لے کر آگے بڑھی۔

ذولتی ڈنگاتی پتھروں پر قدم جمانی آخر کار وہ دوسری سمت پہنچ ہی گئی۔ اب دوبارہ اونچی ڈھلان تھی۔ وہ بھی اس نے بخوبی طے کر لی۔

جنگل میں بادلوں اور کبر نے بھول بھلیوں کا سا سماں پیدا کیا ہوا تھا۔ کوئی سرا کوئی سمت تو نظر آتا نہیں تھا۔ وہ اندازے سے آگے بڑھنے لگی۔

کچھ دور جا کر وہ ٹھٹھک سی گئی۔ پاس ہی کہیں سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی تھی۔ اسکا دل ایک بار پھر دھڑکا۔ کہیں وہ ہی تو نہیں تھا۔ ایک درخت کے چوڑے سے تنے کے

پیچھے سے وہ مڑ کر دیکھنے لگی۔

وہ ہی تھا۔ سو فیصد وہی تھا۔ وہ اسے ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ عام سی جینز پر جیکٹ پہنے چہ قدم نیچے دیا کے سرخ پر آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ جیسے رائیڈنگ کا یہ آخری مرحلہ تھا۔

اپنے پلان کے مطابق ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر۔ دھنک وہیں لیٹے ہوئے اگلی جانب جا رہی تھی۔ انجام کیا ہوگا؟ یہ سوچنے کو اس نے وقت ہی کب لیا تھا۔ فخر عالم

تک ڈھلان پر بڑھتے ہوئے تو اسے خامس چوٹ نہیں آئی تھی مگر اسکے گھوڑے کے ہاتھوں

مٹانے کے بھاسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

READING
Section

وہ دونوں سہارا دیکر اسے بیڈروم میں لے آئے۔ آرام وہ بستر پر لٹایا۔ اسکے جو گرز اتارے اور کندھوں تک نرم و گرم کبل اوڑھادیئے۔
تھوڑی ہی دیر میں سائیس کیساتھ والا آدمی اس کیلئے اوڈٹسین ملا کر گرم دودھ لے آیا۔
شاید فخر عالم نے کہا ہوگا۔ دھنک نے سوچا۔
مگر نہیں۔ اس نے فوراً اپنی سوچ کی تردید کی۔
وہ کرٹسی، ہمدردی اور مہربانی جیسے جذبوں سے عاری لگتا تھا۔
تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر بھی آ گیا۔ آتے ہی اس نے اسے ٹینس کا انجکشن لگایا۔
تبھی فخر عالم اندر آ گیا۔ کچھ دیر قبل والا Casual ڈریس پہنچ کر لیا تھا۔ ڈارک بلو تیشی سوٹ میں بلبوس تھا اس وقت۔
”گڈ مورنگ سر“۔ نوجوان ڈاکٹر متودب طریق سے بولا۔
”مورنگ“۔ وہ دھیرے سے بولا۔ اور۔

ایک سرسری نگاہ دھنک پر ڈالتے ہوئے پرلے سرے پر جا کر کھلی کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔
”چونین بہت آئی ہیں مگر۔ ہاتھ پیر سلامت ہیں“۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے فخر عالم کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔
”I see“۔ ڈاکٹر کی مسکراہٹ کے بدلے میں اس نے سنجیدگی سے کہا اور۔
رخ اندر کی طرف کر کے ڈاکٹر کو مختلف زخموں کی صفائی کرتے دیکھنے لگا۔
اسکی دودھ جیسی سفید کلائیوں اور چہرے کی سیب جیسی رنگت کو جو اس وقت کھلا کر کچھ اور بھی پرکشش لگ رہی تھی، نظر انداز کرتی اسکی نظریں بڑی ہوشیاری سے ٹیوں کیساتھ ساتھ گردش کر رہی تھیں۔
”کہنی کے پاس Stitches آئیے سر“۔ ڈاکٹر فخر عالم کو جیسے اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

گئی ہو۔ ٹہلی منزل کو سوائے ایک آدھ کھڑکی کے تمام پھول پودوں نے چھپا رکھا تھا۔ مگر کیا قتل۔ جنت کا کوئی ٹکڑا جیسے زمین پر آ رہا تھا۔ اور۔

اسکائین۔ اب بھی اسے اپنے آگے بٹھائے، بازو سے سہارا دیئے اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اسکے اتنے قریب تھی کہ اسکی لگائی ہوئی مدھر پرفیوم کی مہک بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

پچھلے چند تانوں کو وہ جیسے اسکا قاتل ہونا بھول گئی تھی۔ اچانک ہی اسکی تمام تر نفرت لوٹ آئی۔ کسماکس اس سے الگ ہونے لگی۔

”آپ ٹھیک سے بیٹھیں پھر گر جائیگی“۔ وہ راستے پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔
”میرے علاقے میں کسی کو میری اجازت کے بغیر گھسنے کی اجازت نہیں۔ آپ شاید یہاں اجنبی ہیں۔ اگر آپکی جگہ کوئی لڑکا ہوتا تو اس وقت حالات شاید کچھ اور ہوتے...“

ہونہ۔ حالات اور کیا ہوتے؟ مار ڈالتا اسے قتل کر دیتا۔ بھاری رقم دیکر ایک بار پھر جان چھڑو لیتا۔

دھنک کی نفرت سوا ہو گئی۔ اسکا ساتھ اسکی برداشت سے باہر ہونے لگا۔
مگر۔ یہ کیا کم تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔
کہنی کھنسی سانس لیتے ہوئے اس نے اپنے سر اپے پر نگاہ کی۔
اسکے کپڑوں پر وہ اتنی جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ ہائیس کہنی پر تو خاصا بڑا زخم آیا تھا۔
گھر پہنچے ہی اسکا سائیس بھاگتا ہوا اسکی مدد کو آیا۔ اسے دیکھ کر دور سے گزرتا ایک اور ملازم بھی دوڑا آیا۔

”انہیں گیسٹ ہاؤس لے جاؤ“۔ گھوڑے سے اترتے ہی اس نے دونوں کو حکم دیا۔
”چونین آئی ہیں۔ اکرم سے کہو ڈاکٹر کو بلوانے“۔

نور۔ بڑے بڑے ڈگ بھرتا وہ گھر کی طرف بڑھا۔
گھر کے عقب میں گیسٹ ہاؤس تھا۔ بالکل گھر سے ملتا جلتا۔

اسے اچھی لگ رہی تھی۔ وہ یوں ہی خالی خالی نظروں سے کھڑکی میں سے باہر گھورتی رہی۔
تبھی دھیرے دھیرے بادل کمرے میں سے باہر نکلے۔ بادلوں میں لپٹے قرمی پائیز
بھی نظر آنے لگے۔ مگر۔۔۔

یکدم ہی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش کی شکل
اختیار کر لی۔

وہ پہلے بھی ایسے علاقوں میں گرمیوں کے موسم میں آچکی تھی۔ پہلے بھی یہ سب دیکھ چکی
تھی۔ مگر ہر بار گھاٹیوں میں پہاڑوں پر درختوں میں سے لپٹے لپٹائے یہ بادل اسے نئے
لگے۔ ہل میں دھوپ ہل میں بادل اسے نرالے لگے۔ کبھی بوند باندی اور کبھی موسلا دھار
بارش اسے انوکھے لگے۔

تبھی اسکے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اسکی محویت ٹوٹی۔ ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھایا۔

”یس دھنک سپیکنگ“۔ اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

”میڈم! میں کچن سے اسلم بول رہا ہوں۔ آپکا لٹچ ایک بجے گیا تھا مگر آپ آرام کر رہی
تھیں۔ اس وقت بھجوادوں؟“

”نو تھینک یو۔ کھانا نہیں، چاہئے بھجوادیں پلیز!“

”جو حکم“۔ اور فون بند ہو گیا۔

اسکے اس جنگل میں داخل ہونے کے بعد سے اب تک اس کیساتھ صرف ملازموں نے
یا پھر اس ڈاکٹر نے بات کی تھی۔ فخر عالم نے پوچھا تک نہیں تھا کہ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی
تھی؟ کیا کرنے آئی تھی؟ یا پھر اسکی طبیعت کیسی تھی؟ کھانا پینا مل رہا تھا یا نہیں؟
ہاں سوائے شروع کے ایک دو جملوں کے۔

وہ بھی یہ جتانے کہ وہ اسکے علاقے میں بغیر اجازت آئی تھی اور یہ بھی کہ چونکہ وہ ایک
لڑکی تھی اسلئے وہ اسے اٹھا کر لانے اور ڈاکٹر کو دکھانے کا احسان کر رہا تھا ورنہ اگر لڑکا ہوتی تو

”Yes, go ahead.“ اس نے کہا۔

اور مزید کچھ کہے بنا بڑے بڑے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نے Stitches لگائے تمام زخم ضرورت کے مطابق صاف کئے، دوائیاں،
پٹیاں کیں، دوائیوں کا نسخہ لکھا، استعمال سمجھایا۔

”آجکادن ڈراریسٹ لیں۔ خوب کھائیں پیئیں۔ ٹھیک ہو جائیگی۔ کل میں پھر آؤں
دیکھنے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی اور چل دیا۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اسکی دوائیاں آچکی تھیں۔ اسے بہترین ناشتہ کرایا گیا تھا۔
اور اس وقت وہ پھر لیٹی سامنے کی کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اونچے اونچے پائیز کا
ویو بڑا کمانڈنگ تھا۔ اپنے مالک جیسا!

جانے کیوں ایک لمحہ کو اس نے سوچا اور پھر فوراً ہی جیسے اپنی سوچ بھی حقیر لگی۔ اس نے
رخ ہی دھری طرف موڑ لیا۔

یہاں تک تو وہ پہنچ گئی تھی۔ اتنی آسانی سے اسکی یہ سکیم کارگر ہوگی اسکے گمان میں بھی نہیں
تھا اسے اپنے زخم اپنی سکیم کے کامیاب ہونے کے مقابلے میں ہیج لگے۔ وہ اس سے بھی زیادہ
سہم سکتی تھی یہاں تک پہنچنے کیلئے۔

آجکادن وہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق ریسٹ لے گی اور پھر۔۔۔ کل سے اپنے
منصوبے کے باقی حصے پر عمل پیرا ہوگی۔

اس نے تسلی تسلی آنکھیں موند لیں اور۔۔۔

آرام کی دوا کی وجہ سے اسے جلد ہی غنودگی نے آیا۔

شام پانچ بجے اسکی آنکھ کھلی۔ کھلی کھڑکی میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن۔۔۔ اسے
تو کز بھر پائیز کے درخت تک نظر نہ آ رہے تھے۔ بادلوں کا ہجوم کھڑکی کے راستے اندر
گھنٹے گھنٹے ترار تھا۔ اسے سانس مشکل سے آنے لگی، اس کے باوجود بادلوں کی مخصوص مہک

گو باہر بہت ٹھنڈی تھی، گپ اندھیرا تھا، سائیں سائیں کرتے دیو قامت درخت تھے، بھوتوں کا جیسے بسیرا تھا پورے جنگل میں۔ اس پر قدموں کی آہٹیں، دہلی دہلی سرگوشیاں۔ سب کتنا پر اسرار تھا!

بغیر وقت ضائع کئے اس نے صوفے کے بازو سے اپنی جیکٹ اٹھائی اور پہننے ہوئے کوئی آہٹ کئے بنا آہستہ سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ چاروں طرف دیکھا۔ کچھ نہیں تھا۔ وہ اور آگے بڑھی۔ فخر عالم کے گھر تک گئی۔ اب آہٹیں واضح ہو رہی تھیں، ہاتھیں گوصاف سنائی نہ دیتی تھیں مگر پہلے کی نسبت نمایاں ہو رہی تھیں۔

وہ دیوار سے چپکتی چپکاتی اسی سمت بڑھی۔ کونجی کے بائیں طرف جہاں گاڑیاں پارک ہوتی تھیں وہیں ہو رہا تھا کچھ۔ دیوار کے کونے سے جو جھانک کر دیکھا تو اوپر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے رہ گئی۔ فخر عالم نے لمبا اوڈر کوٹ پہن رکھا تھا۔ کالر اوپر اٹھایا تھا جو چہرے کو چھپائے تھا۔ ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں دوسرے میں ٹورچ تھا۔ جسے وہ کبھی کبھی روشن کر لیتا۔ اور۔

اسی لمحے بھر کی روشنی میں دھنک نے دیکھا دو شخص سفید چادر میں لپٹی ایک لاش کو ٹرک میں رکھ رہے تھے۔ لاش کو رکھ کر ایک آدمی وہیں لاش کے پاس بیٹھا رہا اور دوسرا نیچے اتر آیا۔ فخر عالم نے جیب سے کچھ رقم نکالی، اس آدمی کو دی، کچھ ہدایات دیں اور وہ شخص بھی ٹرک میں جا بیٹھا۔ دونوں آدمی سبے سے لگ رہے تھے۔ پھر ٹرک سٹارٹ ہوا، روانہ ہوا۔ اور فخر عالم آہستہ آہستہ چلتا گھر کی طرف والا موڑ مڑ گیا۔

تو ایک۔ اور قتل کیا تھا آج اس نے! دھنک کے کانوں تو لہو نہیں تھا بدن میں۔ وہ ایک جرنلسٹ تھی، بولڈ بھی تھی۔ مگر۔ ایسے مناظر تو بڑے بڑوں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ اسکے پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ جیسے نیسے کر کے وہ اپنے کمرے تک پہنچ گئی۔

بقی تک نہیں جلائی۔ چپکے سے بستر میں گھس گئی۔

شاید وہیں سے باہر پھینگوادیتا۔ یا پھر جانے کیا سلوک کرتا اس کیساتھ؟

وہ آہستہ سے بستر سے اٹھی۔ اسکا بیگ الماری میں رکھا تھا۔ اس میں سے پیڑ اور پینا نکالے۔ سامنے والے صوفے پر بیٹھی اور۔ ابتدا کی!

جناب ایڈیٹر صاحب!

یہ آدمی بد خو ہے بلکہ بد تمیزی کی حد تک بات کرتا ہے۔ لمبے قد کا بہت ہی ہینڈسوم شخص ہے مگر بہت ریزروڈ اور جیسے کئی راز دل میں چھپائے ہے۔ بہت کم اور بہت سوچ کر بولتا ہے جیسے انکی کسی بات سے کوئی راز کھلنے کا اندیشہ ہو۔ کسی کو چوٹ آئے، زخم آئیں انکی بلا سے۔ آنکھوں تک سے ہمدردی نہیں جھلکتی۔

میرا یہاں پہلا دن ہے۔ خدا کرے جلد ہی کوئی Clue مل جائے، بلکہ جیسے جیسے Hints ملنے جائیں گے میں خطر روانہ کر دیا کرونگی۔ یا فون پر بتا دیا کرونگی... "

وہ دوبارہ اٹھی۔ پین واپس بیگ میں رکھا اور پیڈ نہایت احتیاط سے الماری میں بچھے اخبار کی تہ میں چھپا کر رکھ دیا۔

پھر وہ ہاتھ روٹ مٹی۔ منہ ہاتھ دھوئے۔ واپس آ کر سکارٹ ریڈ کپڑے نکالے۔ ڈریسنگ روم میں جا کر خون کے داغ دھبوں والے کپڑے بدل کر صاف پہن لئے۔ آہستہ آہستہ بالوں میں برش کیا۔ کپڑوں پر اپنا پسندیدہ کلون پرے کیا۔ تو جیسے طبیعت بہت ہلکی محسوس ہوئی۔ رات کھانے کے بعد اس نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دو اینٹیاں لیں اور۔ سو گئی۔

رات کے دو بجے کے قریب کچھ آہٹوں، بد بے سے شور سے اسکی آنکھ کھل گئی۔ چند لمحے تو وہ اسے یوں ہی اپنا واہمہ سمجھتی رہی۔ مگر۔ اب بھی وہی قدموں کی آہٹیں تھیں، دہلی دہلی ہاتھیں تھیں۔ کہیں پاس ہی، کہیں قریب ہی۔

انھہ کردہ کفر کی کے پاس آئی۔ سوائے پائینز کے سائیں سائیں کے اس طرف تو کچھ نہیں تھا۔

ہا۔ کچھ تھا ضرور۔ لیکن وقت تھا، یہی موقع تھا۔ اسے کھونا نہیں چاہیے تھا۔

باقی کی رات اس نے آنکھوں میں کافی۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ کبھی نظروں میں نہیں
 کپڑے میں لپی لاش کبھی دو سب سے آدی کبھی پر اسرار فخر عالم کا اس آدی کو رقم دینا، کچھ ہدایت
 دینا۔ لاش کو پانی میں بہا دینے کی یا پھر کہیں گھڑا کھود کر دبا دینے کی۔ اسے پاس رہا
 دیا، سارا جگل مقلوموں کے مدفن لگے۔ سائیں سائیں کرتے بلند و بالا درخت فریاد کرتے
 سکماں بھرتے محسوس ہوئے اور۔ باہر کی سیاہ تاریکیاں ماتم کناں گلنے لگیں۔
 تمام رات وہ بستر میں دیکھی پڑی رہی۔

سورج کی پہلی کرن کیساتھ اسکی جان میں قدرے جان آئی۔ رات والا واقعہ گواہ بھی
 ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔

وہ آہستہ سے بستر سے اٹھی۔ اسکے جوڑ جوڑ میں درد ہوز ہوا تھا۔ ہاتھ روم جا کر اس نے
 منہ ہاتھ دھوئے۔

ڈریسنگ روم میں آ کر خوبصورت بالوں پر برش کیا۔ حسین چہرے ہر نئی مائل شریقی
 آنکھوں اور پیار سے پرینڈ کپڑوں میں وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ وہ بہت کم کپڑے ساتھ
 لائی تھی۔ اسے زیادہ کپڑوں کی نہیں فخر عالم پر زیادہ نگرانی کی ضرورت تھی۔ فخر عالم۔
 اسے جھرجھری سی آگنی۔ اتنی ڈشنگ پر سینٹلی والا شخص کیونکر ایسے کاموں میں پڑ گیا
 تھا؟ یا پھر دولت اور املاک چیز ہی ایسے ہیں کہ انسان کو قتل تک پر مجبور کر دیتے ہیں۔
 ”ٹرن... ٹرن...“ فون کی گھنٹی پر وہ اچھل سی گئی۔

کمرے میں آ کر ریسیور اٹھایا۔ کان سے لگایا۔
 ”اسلم بول رہا ہوں میڈم۔ میرے نے بتایا تھا۔ آپ جاگ رہی ہیں اسلئے بیڈنی بھوادی
 ہے۔ آپ پلیز بتائیں کہ بریک فاسٹ میں کیا پسند کریں گی؟“ وہ بہت مہذب طریق سے
 بول رہا تھا۔

فخر عالم کے ملازم تک اچھے اور ایجوکیٹڈ لگ رہے تھے۔ اتنا اچھا خوبصورت ماحول تھا
 مگر۔

رات کے اندھیروں میں جرم ہوتے تھے یہاں!

اسلم کو ناشتے کا بتا کر وہ چند ٹاپے کھڑکی کے کھلے پٹ سے ٹک لگائے باہر دیکھتی رہی۔

”میڈم اب کیسی طبیعت ہے آپ کی“۔ وہ بڑے خلوص سے بولا۔

”بہتر ہوں شکریہ“۔ وہ ممنونیت سے بولی۔

یہاں سب لوگ اچھے تھے۔ سوائے فخر عالم کے۔

”میڈم کسی چیز کی ضرورت ہو تو فون پر کہہ دیجئے گا۔ آج کچن میں مصروفیت کچھ زیادہ ہے۔ صاحب کے ایک خاص دوست آنے والے ہیں...“ وہ نرے صوفے کے قریب میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

”اوہ اچھا۔ اور تو کچھ نہیں چاہیے بس آجکا اور پچھلے دو دنوں کے اخبار چاہئیں اگر لاسکو تو۔“ اخبار پڑھے بغیر اسے چین ہی نہیں آتا تھا۔ اور پھر آج تو تیسرا دن تھا اس نے اخبار کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

”کیوں نہیں۔ ابھی لاتا ہوں میڈم۔“ وہ مؤدب طریق سے بولا۔

اور باہر نکل گیا۔

بستر میں لیٹی وہ۔ یکے بعد دیگرے تینوں اخبار دیکھ رہی تھی۔

تبھی وہ دروازے پر دستک سے چونکی۔

ڈاکٹر تھا، ساتھ میں ایک ملازم۔

”سنائیے کیسی ہیں آپ“۔ وہ ایک بے تکلف دوست کی طرح بولا۔ پاس آ کر اسکی نبض

تھام لی۔ کل بخار تو نہیں ہوا؟“

یہ ڈاکٹر ہی اچھا تھا۔ اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور تو نہیں تھا۔

”ہوا تھا بلکاسا۔“

”پھر؟“ اسکی نظریں اپنی کلائی پر گھڑی پر تھیں۔

”گولیاں کھالی تھیں اتر گیا تھا۔“

”اس وقت تو نہیں ہے۔“ اب وہ زخموں کی طرف متوجہ ہوا۔

اسکی کہنی الٹ پلٹ کی۔

اس وقت پھر اونچی چوٹیوں پر دھوپ اور نیچی کھائیوں میں بادل منڈلا رہے تھے۔ فخر عالم گھر دھوپ کی نرم و گداز کرنوں میں سنہری ہو رہا تھا۔ اور دور۔۔۔ نیچے کھائی میں اندھیرا اور بادل دونوں گنڈم ہو رہے تھے۔ پھر۔۔۔ اس پار کھائی سے آگے اوپر کو اونھی ڈھلان پر ناکہ دکا اور ادھر ہر بکھرے چھوٹے چھوٹے گھروں کی ٹین کی چھتوں کو ایک بار پھر سورج کی شعاعیں منور کر رہی تھیں۔ کہیں دھوپ، کہیں بادل۔۔۔ روح تک سرشار ہو رہی تھی۔ اور۔۔۔

کچھ فاصلے پر اس نے دیکھا۔ اپنے جنگل میں فخر عالم ٹریک سوٹ پہنے ایک بھاری بھر کم کتے کی زنجیر تھامے صبح کی واک میں مصروف تھا۔

فخر عالم۔۔۔ جانے کیوں ایک بار پھر وہ خوفزدہ سی ہو گئی۔

اور پھر اسے خیال آیا۔ رات والا واقعہ قلمبند کر کے کچھ تو مواد اکٹھا کر لے۔

الماری سے پیڑ اور چین نکال کر وہ صوفے کے بازو پر بیٹھ کر لکھنے لگی۔

”..... رات کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ مسٹر فخر عالم نے کسی کو قتل کیا تھا۔ لاش ٹرک میں

ڈالتے وقت میں نے خود دیکھ لیا۔ گو اس نے بتیاں نہیں جلائی تھیں مگر اسکے ٹورچ کی روشنی

میں میں بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ دو آدمی جو لاش کو ٹھکانے لگانے پر مامور تھے وہ بھی چپ اور بے

ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو فخر عالم نے جیب سے کچھ رقم نکال کر دی ساتھ ہی دھیرے

دھیرے کچھ ہدایات بھی۔ جو میں نہ سن پائی۔

میرا مجھے خود بھی جلدی ہے۔ اسکے کیریئٹر کے Hints تو مل رہے ہیں۔ مگر بس ایک

چیز کا مجھے انتظار ہے کہ کسی طرح پتہ چل سکے کہ اپنی بہن کو اسی نے مارا ہے۔ میں آج آپکو فون

کرنے کی بھی کوشش کرونگی۔

اتنا لکھ کر اس نے پھر اسے الماری میں اخبار کی تہ میں چھپا لیا۔

معاذ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ اچھل کر رہ گئی۔ اچھا تھا پیڑ چھپا تو لیا تھا۔

”یس۔ الماری سے بنتے ہوئے اس نے اپنے آپکو سنبھالا۔

یہ تھا۔ ناشتے کی نرے لئے اندر آیا۔

گارڈز ہوتے ہی ایسے ہونگے۔ بہر حال۔ ذرا غور کیا تو کچھ فاصلے پر جہاں وہ گھوڑے کے ٹاپوں میں آئی تھی اسکا چیننگ برش پڑا نظر آیا۔ آگے بڑھ کر اس نے اٹھالیا۔ برش کو مٹی سے صاف کرتے کرتے اس نے دیکھا گارڈ نہایت چوکنا ہو کر اسکے ہاتھ میں پکڑے برش کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ہنسی آگئی۔ جیسے اس نے برش نہیں کوئی بم تھام رکھا تھا ہاتھوں میں۔ خبر۔ اسے برش کیساتھ پہلی بار یاد آیا وہ تو یہاں چیننگ کے بہانے سے گھسی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھائی۔ سفید ڈیزی کے پھولوں سے اٹی ڈھلان۔ جیسے پھول ہی پھول تھے اور بس!

وہ جب بھی اس پہاڑی علاقے میں آئی تھی ڈیزی سے لدے ڈھلانوں کو دیکھ کر جی چاہا تھا اتار لے سب کو ایک دن کیسوں پر۔ اس وقت اسکے پاس کیسوں تو نہیں تھا مگر۔ گتے کا ٹکڑا، بکڑی کی ہی سٹخ پر وہ ان ڈیزی کو اتار سکتی تھی۔ رنگ اور برش تو تھے ہی پاس۔ کسی وقت کرنے کی کوشش!

ادھر ادھر گھوم پھر کر وہ کافی دیر بعد کمرے میں واپس آگئی۔ شام کی چائے کیساتھ اس نے دوائی لینی تھی۔

کمرے میں داخل ہوئی تو مدھر پر فیوم کی مہک نے توجہ کھینچ لی۔ پہلے بھی یہی مہک وہ محسوس کر چکی تھی پر۔ کہاں؟ اس نے ذہن پر زور دیا۔ یاد آیا۔ فخر عالم اسے گھوڑے پر بٹھا کر گھرارہا تھا تو یہی مہک اسکے جسم میں سے آرہی تھی۔

کیا فخر عالم آیا تھا اسکے کمرے میں؟ اس نے حیرت سے سوچا۔

یکدم ہی جانے کیوں وہ الماری کی طرف بڑھی، اخبار کی تہہ ٹولی۔

”اوہ“۔ اس نے جیسے نجات کی سانس لی۔ اسکا پیڈ اور نوٹس اپنی جگہ پر موجود تھے۔

پھر وہ مسکرا دی۔ وہ بھی کتنی گھبرا گئی تھی۔ فخر عالم کا الماری میں اخبار کی تہوں میں کیا

کام؟

پر۔ وہ آیا ضرور تھا۔ شاید اسکی حالت دریافت کرنے۔ یا پھر اسے یہاں سے چلنا

اور پانچویں دن Stitches کھلیں گے۔ تین چار دن بعد۔“
تین چار دن جانے وہ یہاں رہتی بھی تھی یا نہیں؟ ویسے وہ بھی عجیب بن بلائی مہمان تھی۔ نالی میزبان نے کبھی مڑ کر پوچھا تھا کہ وہ کیوں آئی تھی؟ کب جائیگی؟
”آپ۔ بولا کریں۔ چلا پھر کریں...“
وہ دیر سے مسکرا دی۔

”یہ اتنے خوبصورت دانت۔ چھپانے کیلئے تو نہیں ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
گو اسکی بات میں سادگی تھی۔ کوئی معنی نہ تھی۔ پھر بھی دھنک کارنگ سرخ سا ہو گیا۔
ڈاکٹر چلا گیا۔

آج واقعی گھر میں گہما گہمی ہی تھی۔ بقول ملازم فخر عالم اپنے دوست کو لینے خود ایئر پورٹ گیا تھا۔

اور پھر دوپہر تک جو دونوں آپہنچے تو جیسے ہنگامہ سا برپا ہو گیا گھر میں!
ادھر ادھر گھومتے گھماتے۔ اس نے پہلی بار فخر عالم کے جاندار قبضے سے۔ پہلی بار بے تکان بولتے سنا۔ پہلی بار کسی سے بے تکلفی سے باتیں کرتے سنا۔

آج وہ دوپہر کو سوئی نہیں۔ یوں ہی جنگل میں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ پائینز کی مخصوص خوشبو، سفید ڈیزی، خود رو گلانی رنگ کے چارپتوں والے ننھے ننھے سے پھول، سرائٹھائے اونچے اونچے Snake plants اور پھر ایک نوخیز چھوٹی چھوٹی پتیوں والی جھاڑی میں لگے سفید منے منے ستارہ نما چنبیلی کی سی خوشبو والے ان گنت پھول۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔

اس نے نوٹ کیا مختلف جگہوں پر مسلح گارڈز متعین تھے۔ وہ اس رخ پر بھی گئی جہاں سے اس نے دریا پار کیا تھا، آئی کے گھر کا تعین بھی ہو سکتا تھا وہاں سے۔ پھر وہ جگہ جہاں سے وہ لڑھک کر فخر عالم کی طرف گئی تھی۔ ایک گارڈ آج یہاں بھی موجود تھا۔ اس نے محسوس کیا ہر گارڈ اسے پراسراری نظروں سے گھور رہا تھا۔ شاید فخر عالم نے جو کس کروائے تھے یا پھر

”وہ سامنے فون رکھا ہے میڈم۔“ پیرا سے ہال میں داخل ہوتے ہی اشارے سے فون دکھا کر واپس چل دیا۔

وہ ہال میں بنی خوبصورت کارپنڈ چوڑی میزھیوں کے قریب سٹینڈ پر رکھے فون کی طرف بڑھنے لگی۔

معاں کی نظر اوپر میزھیوں کے لینڈنگ پر گئی۔ فخر عالم تھا۔ ڈارک گرے قیمتی سوٹ میں لمبوس آہستہ آہستہ میزھیوں اتر رہا تھا۔ اور۔۔۔

دھنک کورات والا واقعہ یاد آیا۔ ایک منجھ کر دینے والی بیخ بستہ لہر اسکی ریڑھ کی ہڈی میں سے تیر گئی۔ پھلی پھلی آنکھوں سے وہ اسے دیکھنے لگی۔

اس وقت اسکی نظروں میں وہ اجنبیت نہ تھی جو پہلے دن تھی۔ چہرے پر وہ سنجیدگی نہ تھی جو اس دن تھی۔ مضبوط جڑے بھی اس سختی سے جڑے نہیں تھے جیسے کل تھے! اسکی کچھ ہمت بندھی۔

”گڈ ایوننگ میم۔“ پاس آتے ہوئے وہ بہت دوستانہ انداز میں بولا۔

فخر عالم۔ بات کرے۔ وہ بھی ایسے نرم انداز میں!

”ہیلو۔“ اچھا تھا وہ بکلائی نہیں، آواز پر قابو پالیا تھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپکی؟“ اسکے پرکشش لبوں پر مبہمی مسکراہٹ تھی۔

اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، وہ مسکرایا بھی تھا۔

”ٹھیک ہوں۔ جھینک ہو۔“ اسکے چہرے پر حیرت ضرور تھی۔

”آپ۔۔۔ یہاں کیسے؟ میرا مطلب ہے۔۔۔“ موہوم سی مسکراہٹ اب بھی اسکے لبوں کو چھو رہی تھی۔

”وہ۔۔۔ ایک فون کر سکتی ہوں؟“ اس نے اجازت تو بہر حال لینی تھی۔

”اوہ۔۔۔ Sure“ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ ایک طرف بڑھا۔

دھنک نے ٹرک بنگ سے ایڈیٹر کا نمبر ملانے کو کہا اور وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

کرنے۔

تجبی وہی صبح والا پیرا قیوم اسکی شام کی چائے لے آیا۔

چائے کیساتھ ہنر بریف اور بسکٹ تھے۔ جانے اس خاطر تو واضح کی فخر عالم کو خبر بھی تھی؟ وہ اندازہ نہ کر سکی!

”میں ایک ضروری فون کرنا چاہو گی۔“ اس نے قیوم سے کہا۔

”جی ضرور کیجئے۔ یہاں اس فون سے تو آپ ڈائریکٹ بات نہیں کر سکیں گی۔ ہمارے

آپریٹر سے کہنا پڑیگا۔ ہاں ادھر صاحب کے فون سے آپ بات کر لیں۔“

”ہوں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

آپریٹر کو نمبر ملانے کی غلطی تو وہ نہ کر سکتی تھی۔ کہ فوراً پتہ چل جائیگا کہ اس نے میگزین کے دفتر میں فون کیا تھا۔ پھر کون جانے آپریٹر ساری بات سن بھی رہا ہو۔

رہ گئی فخر عالم کے فون سے بات تو۔۔۔

”مسٹر فخر عالم کے فون سے بات ہو سکتی ہے؟“ اس نے شاید تصدیق چاہی۔

”ہاں۔ کیوں نہیں۔“ وہ احماد سے بولا۔

”تم ذرا تھم کر آنا چائے جتنا ہوں پھر تم میرے ساتھ گھر تک چلنا۔“ وہ اس سے قبل فخر عالم کے گھر گئی نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد پیرا آیا تو اسے ساتھ لے کر فخر عالم کے گھر کی طرف چلا۔ کہہ اتنی تھی کہ گھر کے سامنے والے لنگڑی کے ہل پر چلنا تو کجا اسے ساتھ ساتھ چلنا قیوم بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس

ہل پر روشن کعبے کی نوک لائی ہی راتے کا تعین کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی گئی۔ ہال کے دروازے کے قریب پہنچے پہنچے کہ چھٹ گئی۔ اب سب صاف نظر آ رہا تھا۔

باہر بادل اور کہر کی وجہ سے دھند لگے کے سبب ہال میں بیک وقت کرسٹل کے کئی قیمتی

فالوس روشن تھے۔ اسکے پاؤں کے نیچے قالین بہت گداز تھی۔ دیواروں پر لگی پینٹنگز بہت

مہذب تھیں اور۔۔۔ جا بجا ایسٹارڈ عکسوں میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ وہ آگے بڑھی۔

"You're welcome." فخر عالم نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

اسکے کان تو جیسے واقعی اسی پر لگے تھے!

بچے تلے قدم اٹھاتی وہ باہر نکل آئی۔

رات اسکا ذہن بھی خاصا پرکھل گیا تھا۔ یوں تو روز ہی لگتا تھا وہ کوئی خاص مہمان تھی، اور خاص

تواضع ہو رہی تھی اسکی مگر آج کچھ زیادہ ہی توجہ دی گئی تھی۔ فخر عالم کا خاص دوست جو آیا ہوا تھا۔

کھانے کے بعد وہ بستر میں لیٹے لیٹے ہی ٹیلی ویژن پر نمودار ہوتی رہی۔ نمودار ہونے تو وہ

اٹھی۔ ٹی وی بند کیا۔ کپڑے تبدیل کئے، ٹائیڈ سوٹ پہنا اور بستر میں گھس گئی۔

آنکھیں بند کر کے وہ سونے کی کوشش کرنے لگی مگر

اچانک فخر عالم اور اسکے دوست کے فلنگ شگاف تہقہ کانوں میں پڑے۔ چند لمحوں تو وہ

یوں ہی لیٹی سنتی رہی۔ پھر جانے جی میں کیا سمائی؟

اٹھی۔ جتنی نہیں جلائی کہ جنگل میں جا بجا ایستادہ سٹریٹ لیمپس کی کمرے میں آتی مدھم

روشنی ہی کافی تھی۔ اس نے ٹائیڈ سوٹ کے اوپر ہی جیکٹ پہنی، اپنا ٹائڈ سائپ ریکارڈر اٹھایا

اور آہستہ سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

سیاہ بادلوں نے چہار سوبلہ بول دیا تھا۔ اونچے اونچے سر بفلنگ چیز و دیوار کے درخت

چپ چاپ ایستادہ تھے اور جموں پز نما گل کی بالکونیوں میں سے چمن چمن کر آتی مدھم روشنیاں

بہت پر اسرار لگ رہی تھیں۔

تہقہ فخر عالم کے گھر کے اوپر کی منزل سے آرہے تھے۔ اسکا بیڈروم شاید وہیں تھا۔ وہ

سوچ میں پڑ گئی۔ اوپر کیسے جائے؟

پھر جیسے ذہن میں ترکیب آئی۔ جیکٹ اتار وہیں پھینک دی کہ وہ جیکٹ میں پھرتی

سے کام نہ کر پاتی۔ اوپر اس بالکونی کو ایک نظر دیکھا جہاں سے اب بھی تہقہ آرہے تھے۔ چہل

اتارے اور احتیاط سے قریب ترین پائین کے درخت پر چڑھنے لگی۔ پائین پر چڑھنا کوئی

خاص مشکل نہیں تھا۔ اوپر پہنچ کر وہ ہانکل دھیرے سے ہانکنی میں اتر گئی۔

دو دفعہ آپریشن نے کہا کہ باوجود کوشش کے لائین مل نہیں رہی۔ اس نے ایک آخری کوشش

کرنے کو کہا اور بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ یہ فون بہت ضروری تھا۔ وہ بے چینی کیساتھ

ساتھ پریشان بھی تھی۔ اتنی دیر سے فخر عالم بھی وہیں ہال میں موجود تھا۔ بک ویلف میں کوئی

کتاب ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر کال مل بھی گئی تو وہ بات کھل کر کر بھی سکے گی یا نہیں؟

"نورین... نورین... فون کی گھنٹی بجی اور۔"

اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔

کال مل گئی تھی اور انکل اشفاق لائین پر تھے۔

"ہیلو۔" اس نے دھیرے سے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "دھنک بول رہی ہوں۔"

لفظ "دھنک" پر ہی شاید فخر عالم نے مڑتے ہوئے اس پر سر سے لیکر پاؤں تک ایک نظر

ڈالی تھی۔

"ہاں بیٹے سناؤ کیا حال ہے۔ خیریت سے تو ہونا۔" چیف ایڈیٹر اشفاق نے پوچھا۔

"جی بالکل خیریت سے ہوں۔"

"کوئی پروگرام ہے؟"

"وو... وو... فخر عالم کمرے سے ہال کے پرلے کمرے پر صوفے میں بیٹھا ایک

کتاب کے اوراق پلٹ رہا تھا۔ وہ کیسے بات کر سکتی تھی؟

"ہیلو۔ ہیلو... ایڈیٹر تھے۔" خیریت تو ہے نا؟ کب آرہی ہو؟"

"بالکل خیریت ہے۔ آجاؤ گی۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔" وہ خط بھیج دیگی یہ وہ چاہتے ہوئے

بھی نہ کہہ سکی کہ فخر عالم کی نظریں نہ کسی کان ہی اس پر لگے ہوئے تو؟ "اچھا خدا حافظ۔" اور

دھنک نے ریسیور اٹھ کر ڈیل پر رکھ دیا۔

فخر عالم کی موجودگی میں وہ کچھ نہ کہہ پاتی تھی۔ اب تو بس ایک ہی راستہ تھا۔ تمام پروگرامیں

خط میں لکھ کر بھیج دینا۔

"تھینک یو سوچ۔" اس نے فخر عالم سے کہا۔

معلوم نہیں ہوتے... بنا ہے تیرے ہی بیڈروم میں تھی... تیرے ہی بستر پر....
 ”ہاں۔۔۔ میں کبھی اچھی موڈی لاتا تھا تو وہیں میرے بستر میں گھس کر دیکھ لیا کرتی تھی
 ... اس رات بھی ایسا ہی ہوا... فلم دیکھ کر سو رہی تھی... میں دیر سے گھر لوٹا... موقدہ اچھا تھا
 بس... مار دیا۔“

”چا تو سے؟“

”ہاں۔“

”فنگر پرنس؟“

”ارے بھائی۔ اب اتنا بھی بیوقوف نہیں ہوں کہ۔۔۔ فنگر پرنس چھوڑتا۔“

”اچھا کیا یہاں آگئے۔ تمہوڑا سکون ملے گا۔“

”واقعی یار ذہن کا بوجھ کم ہو رہا ہے۔“

”ٹررن... ٹررن...“ اچانک قریب کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

فخر عالم کوشش کر کے آگے بڑھا۔ ریسیور اٹھایا۔ پھر کان سے لگایا۔ پھر بنا کر تھوڑی
 دیر اسے گھورتا رہا۔ پھر کان سے لگایا۔

”یس فخر عالم سپیکنگ۔“ لہجہ ہی ہکلا یا ہکلا یا تھا۔

”کیا؟“ وہ قدرے ہوش میں آیا۔ ”مال پکڑا گیا؟ کس کی ڈیوٹی تھی؟ شٹ اپ
 یو۔ ایڈیٹ۔ ڈرائے فردٹ کے کرش کے اندر رکھے چھوٹے چھوٹے بیٹز کا کسی کو کیسے
 پتہ چل گیا؟“

تھوڑی دیر وہ اور فون کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہا۔ پھر ریسیور رکھ کر دوبارہ
 دوست کی طرف متوجہ ہوا۔

”یار تو نے کہا تھا اسلٹی آئیگی آغوش گرم ہوگی... مگر اسکا ابھی تک کوئی پتہ ہی نہیں۔
 فون کر دو تا...“

اور۔۔۔ دھنک کا جیسے مزہ پارا نہ رہا۔ کوئی خوبی تھی جو اس آدمی میں نہیں تھی۔ ایک

دل دھک دھک ضرور کر رہا تھا۔ کہ وہ زندگی میں پہلی بار کسی شخصیت سے گھبرائی
 تھی۔ خوفزدہ ہوئی تھی۔

شاید اسلے کہ اس سیمینک پر سلیٹی کے پیچھے کئی راز پہناں تھے، کئی اسرار پوشیدہ تھے۔
 اس نے آہستگی سے آنکھ کھلی کھڑکی کے کونے سے لگالی۔ وہیں بالکل کھڑکی کے قریب
 دونوں دیوار قالمین پر نیم دراز گاؤٹکیوں سے فیک لگائے بیٹھے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں
 شراب کے گلاس تھے۔ اور دونوں کو خوب چڑھی ہوئی تھی۔ مست مدہوش لگ رہے تھے۔

ایک اور پوائنٹ! چند س قائل شراب کا بھی رسیا تھا!

وہ یو کھلا سی گئی۔

کس آس پر اسے ایسے لوگوں میں گھرے رہنا مناسب تھا؟ اگر اسی شخص نے اسے کوئی
 نقصان پہنچایا تو؟ اگر وہ قتل کر سکتا تھا تو کسی لڑکی کی عزت اسکے سامنے کیا وقعت رکھتی تھی؟
 اور پھر اس وقت وہ بالکل اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اگر اسے معمولی سا بھی شک ہو اور اسے
 دیکھ لیا تو؟ مگر اسے اسکی بہن کے قتل کے بارے میں بھی تو معلوم کرنا تھا!

نہیں۔ دماغ نے مشورہ دیا۔ یہ وقت مناسب نہیں تھا!

چلتا چلیے اسے۔ دو بے پاؤں مڑنے لگی۔

”یار... کس ہوشیاری سے جان... پچائی ہے... تو نے...“

فخر عالم کے دوست کے ہکلائے ہکلائے الفاظ نے اسکے مڑتے قدم روک لئے۔ کہیں
 یہ اشارہ فخر عالم کی بہن سمینہ کے قتل کی طرف تو نہیں تھا؟

وہ مہروک کر کھڑی ہو گئی۔ ٹیپ ریکارڈر آن کر کے چپکے سے کھڑکی کی جالی سے لگایا۔

”جیسے ہی چیز ہے بھائی پیسہ... پیسے کا کمال ہے سارا۔“ فخر عالم بھی ہکا ر ہا تھا۔

”تم... تجھے... تیرے بری ہونے پر مبارکباد دینے آیا ہوں... ہے تا...“

”جی معلوم ہے۔“

”یار اچھا کیا پتہ کاٹ دیا اسکا... کروڑوں اربوں کی ملکیت میں... جسے بخرے چھے

دو قتل کیا وہ تو لاکھوں کے قتل کا بندوبست کئے ہوئے تھا۔ قاتل تھا، سمگلر تھا، عورتوں کا رسیا تھا!
ٹیپ ریکارڈ رینڈ کرتے ہوئے وہ سن سادماغ لئے آہستہ آہستہ درخت پر سے اترنے
لگی۔ مگر۔

ساتھ ہی اطمینان بھی ہوا۔ اتنی جلدی اور اتنی معافی سے اسے ہر بات پہ چل جائیگی
اسکے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت ترین رپورٹر سمجھ رہی تھی۔
کل صبح ہی وہ یہ تمام نوز اکٹھے لکھ کر ایڈیٹر کو پوسٹ کر دیگی۔ کتنے خوش ہوئے گئے وہ؟ کتنا
نام ہوگا اسکا؟
رات بھر وہ خوشی کے مارے ٹھیک سے سو بھی نہ سکی۔

صبح سویرے اٹھ کر اس نے اوٹن گرین گرم کپڑے نکالے اور جلدی جلدی تیار ہونے
لگی۔ خوبصورتی سے بندھے ہال اور کپڑوں کے ہر رنگ شوز میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔
الماری سے پیڑ اور بین نکال کر وہ رات والا واقعہ قلمبند کرنے لگی۔

”وہ قاتل ہے، سمگلر ہے، شرابی ہے، عورتوں سے کھیلتا ہے، کرہٹ ترین انسان ہے...“
اور تمام صفحات اکٹھے کر کے لگانے میں ڈالے، ہفتہ وار آئینہ کے ایڈیٹر کا ایڈریس لکھا اور
بیرے کا انتظار کرنے لگی۔

جبھی قیوم بیڈٹی لئے اندر آیا۔

”گڈ مورنگ میڈم۔“ اس نے چھوٹی سی ٹرے اس کے آگے میز پر رکھی۔
”گڈ مورنگ۔“

بیراوا پس مڑنے لگا۔

”سنو قیوم۔“

”جی۔“ وہ دو بارہ مڑا۔

”یہ خط ہے بہت ضروری اسے آج ہی نکل جانا چاہیے۔ ہوں۔“

”جیسا حکم۔“ اس نے لٹافہ لے کر جیب میں رکھ لیا۔

دھتک نے اسے خط چھپانے وغیرہ کی تاکید نہیں کی۔ کہ خود سے بھی شک ہو سکتا تھا۔

”اور ہاں آجکا اخبار۔“ وہ نرمی سے بولی۔

”ابھی لایا سرکار۔“ اور وہ چل دیا۔

اسکے ذہن کا بوجھ قدرے کم ہوا۔

گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پینے لگی۔

اسے خود بھی یہاں سے جلد سے جلد چلے جانا چاہیے۔ مگر کم از کم آج نہیں۔ یہ نہ ہو مگر عالم کو کوئی شک پڑ جائے۔ یا کسی کو بھی۔ آج کا دن مناسب نہیں تھا۔ اسکے سچڑ کھانے میں ابھی وقت تھا۔ مگر سچڑ وہ کہیں اور سے بھی کھلو سکتی تھی۔ وہ کسی طرح اس جال سے، بھول بھلیوں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

خالی کپ میز پر رکھ کر جیکٹ پہن کر وہ باہر نکل آئی۔ ناشتہ آنے میں ابھی ویسے بھی دیر تھی۔ وہ گیٹ ہاؤس کے پیچھے جنگل میں نکل گئی۔

جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے سوچوں میں گم وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔

معاظرتیں اٹھا کر دیکھا۔ فخر عالم تھا، بمعہ اپنے خونخوار کتے کے۔

اس وقت پھر وہ اسے دیکھ کر کانپ سی گئی۔ یہ گریک گوڈ اپنے اندر کتنے گھناؤنے جرم

چھپائے تھا

اس نے خود کو سنبھالا۔

”گڈ مورنگ“ وہ خوشگوار سے بولا۔

”ہیلو“ اس نے بھی دیر سے کہا۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ دوزی سے پوچھنے لگا۔

”ٹھیک ہوں۔ شکر یہ۔“

”سچو کب کل رہے ہیں؟“ اس نے مزید پوچھ لیا۔

اور دھتک کو لگا وہ اسے چلنا کرنے کی سوچ رہا تھا۔

بات ٹھیک بھی تھی۔ وہ یہاں کوئی بلائی گئی مہمان تموزی تھی۔

”دو تین دن بعد مگر میں... کل چلی جاؤ گی۔ میری طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے۔“

ایک لمحہ کو وہ چپ سا ہو گیا۔

”ڈاکٹر سے بات کی ہے کل جانے کی۔“

”آج آئیے تو کروں گی۔“

تبھی نے اچانک کہیں سے فخر عالم کا دوست کامران آنکلا۔

”یار اتنی سردی میں کیا کرنے نکلے ہو۔“ وہ اڈور کوٹ کے اوپر گرم ٹوپی پہنے سردی سے ٹھنھرتے ہوئے بولا۔ پھر جیسے یکدم ہی دھتک پر نظر پڑی۔ ”اوہ۔۔۔ ہیلو۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا متانت سے بولا۔

”ہیلو۔“ وہ دیر سے مسکرا دی۔

”ارے۔۔۔ آپکے دانت کچھ زیادہ ہی خوبصورت نہیں ہیں؟“

وہ سرخ سی ہو گئی۔

”میں ہمیشہ سچ بات کہتا ہوں۔ آپ تمام کی تمام یعنی ساری کی ساری، بہت خوبصورت ہیں اور خوبصورت چیز کی تعریف نہ کرنا کفران نعمت ہے...“

اس دوران فخر عالم بالکل سنجیدہ تھا۔

”اب جاؤ۔۔۔ ناشتہ لگ چکا ہو گا۔“ اس نے کامران کو مخاطب کیا۔

”ظہر و یارب بات کرنے دو۔“ بائے داوے آپکا نام کیا ہے مس؟“

”دھتک۔“ وہ دونوں دوستوں کی کھینچا تانی پر پھر مسکرا دی۔

”یعنی تو س و قزح یعنی رین بو۔ گوڈ۔۔۔ کتنا حسین نام ہے۔ کیوں فخر عالم؟“

وہ خاموش رہا۔ جھکتے ہوئے اپنے کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

کامران کی عقل میں شاید آئی گیا کہ فخر عالم اس معاملے میں کوئی رائے دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔

”اچھا Pretty lady ہم چلتے ہیں۔ یہ مجھے زبردستی لے جا رہا ہے ورنہ میرا دل

نہیں چاہتا ایسی Doll like لڑکی کو چھوڑ کر جانے کو۔“

وہ اسکی صاف دلی پر مسکرائے بنانہ رہ سکی۔

”باپ رے یہ دانت، دکھانا ذرا فخر عالم کو یہ بھی نہیں رہ جائیگا۔“

”چلو“ فخر عالم سیدھا ہوتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

اور۔ دونوں چل دیئے۔

دھنک دیر تک ادھر ادھر گھومتی رہی۔ پھر ناشتے کیلئے واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ لگتا تھا فخر عالم اور کامران دونوں اس کی طرف سے ہوتے ہوئے گزرے تھے۔ کیونکہ آج پھر فخر عالم کی مخصوص پرفیوم کمرے کے باہر سے لیکر اندر تک مہک رہی تھی۔

ناشتہ میز پر لگ چکا تھا۔

وہ دیرے دیرے ٹوسٹ پر کھن لگانے لگی۔

تجسبی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اٹھ کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر آتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھالیا۔

”ہیس۔“

”سوری میڈم! آج اخبار نہیں آیا۔“ قوم تھا۔ معذرت خواہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”اوہ۔ کوئی بات نہیں۔“ حالانکہ اخبار کے بغیر اسکا دن گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔

”اور کوئی حکم میڈم؟“

”کوئی نہیں۔“

اور ریسیور کھتی ناشتے کی میز پر آگئی۔

ناشتے سے فارغ ہوئی ہی تھی۔ کہ ڈاکٹر آگیا۔ ساتھ میں فخر عالم بھی تھا۔ گے

پیش اور گے ہنسی ہل اڈور پنے ہمیشہ کی طرح شاعرانہ لگ رہا تھا۔ وہی پہلے دن والی بے

نیازی سے کھلی کھڑکی کے پٹ سے نگ کر باہر جنت نشان نظاروں کو دیکھ رہا تھا۔

”ڈاکٹر! میں کل واپس جانا چاہتی ہوں۔“ دھنک نے آہستہ سے ڈاکٹر سے کہا۔

”کیوں؟“ وہ اسکا ہاتھ ہاتھ میں لئے کلائی کے پاس کے نیل دیکھ رہا تھا۔ جیسے

چمکتے ہوئے بولا۔

”کانی وقت ہو گیا۔ یہاں نیچے میری آئی رہتی ہیں انکے یہاں بھی جانا ہے۔ پھر

واپس بھی لوٹنا ہے۔“

”نہیں۔ آپ نہیں جا سکتیں۔“ ڈاکٹر اسکی آنکھوں میں جھانکا۔ اور۔

فخر عالم نے اچانک رخ اندر کی طرف کر لیا۔

دھنک کا ہاتھ اب بھی ڈاکٹر تھا۔

اب بھی اسکی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ہاں البتہ دھنک کی آنکھیں جھک گئی تھیں،

سیاہ خمیدہ پلکوں نے آنکھوں پر سایہ کر لیا تھا۔

”کیوں ڈاکٹر؟“

اسکا لہجہ کچھ درشت سا تھا جیسے۔ یا پھر یوں ہی دھنک کا خیال تھا۔ نکاہیں اٹھا کر اسے

دیکھنے لگی۔

ڈاکٹر نے دھنک کی کلائی چھوڑ دی۔

”وہ۔ سر! جس ڈاکٹر سے ٹانگے لگے ہوں وہی کھول دے تو ظاہر ہے بہتر ہے۔۔۔“

کوئی بات تھی جو ڈاکٹر گلشی سا لگ رہا تھا۔

”ہوں۔“ کچھ تھا اسکے لب و لہجے میں، اسکی نظروں میں۔ تسمیہ، ممانعت سی۔ جسے

دھنک نظر انداز نہ کر سکی مگر۔

کوئی نام بھی نہ دے سکی۔ کہ اس نے فوراً رخ واپس کھڑکی کی طرف کر لیا تھا۔

”او کے ڈاکٹر۔ سچ کھولنے پھر آ جانا۔“ کہتے ہوئے وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا باہر

نکل گیا۔

”مصلحے اب تو مسٹر فخر عالم نے بھی کہہ دیا ہے۔ اب تو آپکے کناہی پڑیگا۔“

وہ نہ تو مسٹر فخر عالم کی پابند تھی۔ نہ ہی اس ڈاکٹر کے بدلے بدلے روپے کی۔

لیکن وہ چپ رہی۔ کیا کہتی؟

رات مطلع صاف تھا۔ پورا چاند جنگل، کوٹھی اور گیٹ ہاؤس کو نرم و نچ چاندنی سے منور

گھروالے بھی۔“

گھروالے کہہ کر اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ کہ وہ یہ تو کہہ نہیں سکتی تھی کہ وہ پریس کے مشن پر آئی تھی اور اب اسکا مشن پورا ہو چکا تھا۔ اب مزید یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔
 ”سچ تو کہیں بھی کھلوائے جاسکتے ہیں۔“ اس نے مزید کہا۔
 ”نو۔“ اسکے لہجے میں اچانک تیزی آگئی۔ ”تھکم آگیا۔“ سچ یہیں کھلیں گے۔ اور جب تک تم کھل ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔ نہیں جاسکتیں یہاں سے۔“
 اور — وہ اچانک مڑ کر چل دیا۔
 وہ حیران سی اسے بھکتی رہ گئی۔

کر رہا تھا۔ چیز و منور کے اونچے اونچے درختوں میں سے جھانکتا یہ بڑا چاند۔ جیسے پورے ماحول کو سحر میں لے رکھا تھا۔
 نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جینٹ پہنتے ہوئے باہر نکل آئی۔ تھوڑا آگے نکلتے ہوئے چیز کے درخت سے ٹک لگا کر اوپر چاند کو ٹکے لگی۔
 تبھی قریب ہی قدموں کی آہٹ ہوئی۔
 اس نے چونک کر دیکھا۔

دو دھیا چاندنی میں ہائیت سوٹ پر ہانف لینتھ گرم گاؤن پہنے جیبوں میں ہاتھ دیئے نخر عالم آ رہا تھا۔

”آپ... اس وقت... یہاں کیسے آئی ہیں۔“ وہ ملائمت سے بولا۔

”جیسے... آپ آئے ہیں۔“ جانے کیسے اسکے منہ سے نکل گیا۔

”اوہ۔“ اسے جیسے اچھا لگا۔ ”میں تو چاند کیمنے آیا ہوں۔“

”میں بھی چاند کیمنے آئی ہوں۔“

”پہلے اس ایک بات میں تو ہم دونوں میں اتفاق ہے۔“

وہ چپ رہی۔ چاند کو بگتی رہی۔

”یہاں آچو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔“ اس نے پھر کہا۔

”جی نہیں۔ بلکہ میں آپکی بہت تھیک فل ہوں۔ مجھے جہت آرام ہے یہاں۔“ اس

نے اسکا شکر یہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔

”اگر آپکو یہاں آرام ہے تو پھر جانے کا کیوں کہہ رہی ہیں۔“

دھنک نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ چٹان سے ترشابت پگھل کیسے رہا تھا!

”جانا تو ہے نا۔“

”وہ تو ہے پر۔“ وہ جیسے الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ ”اپنے سچ تو کھلوا کر جائیے۔“

”مجھے آج یہاں تین دن پورے ہو گئے۔ میری آنٹی پریشان ہو رہی ہوگی اور... اور...“

کے پتلے پتلے تے بنائے۔ پھر نازک نازک شاخیں۔ اور پھر ہر شاخ کے اوپری سرے پر ڈیزی کے سفید پھول کی جگہ برش سے سفید دھبے بناتی گئی۔ بعد میں وہ انہیں باقاعدہ ڈیزی کے پھولوں میں بدل لیتی۔ پھر اچانک خیال آیا اسکے آس پاس بھی چند پھول اگے تھے۔ ان میں سے ایک توڑ کر وہ اسے تفصیل سے بنا لیتی۔ کتنی چیزیں تھیں اس میں، درمیان والی زردی کا کتنا حصہ تھا وغیرہ۔ بعد میں پھر باسانی باقی پھولوں کو اس کی شکل کا بنا سکتی تھی۔ لکڑی کا پیس اور برش پینٹس وغیرہ پتھر پر رکھ کر وہ نیچے اتر آئی۔ ہاتھ بڑھا کر ایک پھول بمعہ کچھ نازک سی شاخ کے توڑ لیا۔

”اول ہوں“۔ جانے کہاں سے فخر عالم آپہنچا تھا۔ وہی ٹائیٹ سوٹ پر خوبصورت ہاف لینتھ گاؤن لئے۔ وہی شرٹ کے اوپر کے چند کھلے ٹین، اس میں سے جھانکتا اسکا مردانہ وجاہت کا غماز سینہ۔ دھنک کی نظریں جھک گئیں۔ ”پھول توڑنا منع ہے تمہیں معلوم نہیں۔“ اسکی جھکی نظروں کو تکتا وہ اپنے مخصوص دھبے لہجے میں بولا۔

”یہ... بھی...“ ان سے تو جنگل بھرا پڑا تھا۔ وہ پودے پر ہنوز جھکی نظریں اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔۔۔ یہ بھی...“ اسکا چہرہ سنجیدہ آنکھیں شوخ تھیں۔ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ دیئے سامنے دیکھ رہا تھا۔

جانے کیوں دھنک کے خوبصورت چہرے پر سایہ سالہرا گیا۔

اسی طرح جھکے جھکے اس نے پھول کے شاخ کی اسکے باقی حصے کیساتھ گرہ لگالی۔

اور۔۔۔ فخر عالم اسکی اس حرکت پر اچانک زور سے ہنس دیا۔

وہ وہیں بیٹھے بیٹھے حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”نام آتا ہے اسکا؟“ وہ خوشگوار سے پوچھنے لگا۔

”نہیں۔“ وہ اب بھی وہیں بیٹھی تھی۔ چہرہ پھولا پھولا سا تھا۔ اس نے ’ہاں‘ کہنا

ضروری نہیں سمجھا۔

آج دس بجے اسکے ہاتھ کھل جانے تھے۔ اسکے بعد اس نے چلے جانا تھا۔ بیڈٹی پی کروہ اٹھی۔ صاف کپڑے پہنے۔ گئے خوبصورت بالوں میں برش کیا۔ جیکٹ پہنی اور کپڑوں پر اپنی پسندیدہ گلون پہرے کرتے ہوئے ہشاش بشاش سی کمرے سے باہر نکل آئی۔

سامنے ہی مگر خاصی دور ڈھلان پر سفید ڈیزی ڈیزی بکھرے دیکھ کر اسے یاد آیا۔ انکا کچھ سا تو کم از کم کسی چیز پر جلدی جلدی اتار لے۔ بعد میں گھر جا کر وہ اسے کیڑوں پر اتار سکتی تھی۔ اس پاس کا ماحول ریف سا اتار لیتی ساتھ ہی دو ایک پھول۔ باقی وہ گھر پہنچ کر کرتی رہتی۔ یہی سوچ کر وہ واپس کمرے میں آئی۔ ناشتے میں ابھی دیر تھی، بلکہ اس نے خود ہی ہرے سے کہا تھا ناشتہ دیر سے لایا کرے۔ بیڈٹی تو وہ ویسے بھی لے چکی ہوتی تھی۔

اپنے برش اور پینٹس لے کر وہ باہر آئی۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ جلد ہی اسے درخت کے تنے کا گولائی میں صفائی سے کٹا ہوا کھڑا لگایا گیا۔ پرلی طرف درختوں کی کٹائی وغیرہ کا کام ہوتا تھا وہیں سے شاید اھر تک آپہنچا تھا۔ خلاف توقع اسے اچھی چیز مل گئی تھی۔ تقریباً گول پلیٹ سی۔ ہلکاس پرف کچھ لکیریں گھر جا کر کسی کو دست کر لیتی۔ لکڑی کے کٹڑے پر اور نیچرل لگتا!

جنگل ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر اس نے لکڑی کا کٹڑا گھنٹوں پر رکھا اور جلدی جلدی ایک سفید کوٹ دیکھا سے خشک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ گزارے لائق ہوا تو کام شروع کر دیا۔ کدھرے کدھرے کوٹ اور زیادہ تفصیل میں جانیکا اسکے پاس وقت نہیں تھا۔ جلدی جلدی سامنے کے ڈیزی والی ڈھلان کے آس پاس والی کھائی، درخت، ڈھلان کے بیچ میں سے گزرتی پگڈنڈی ڈھلان کے اوپر چلتی پر بنے چند سفید چمکتی ٹین کی چھتوں والے مہولے مہولے مکانات اور پھر ڈیزی کی باری آئی تو ڈھلان پر پہلے تو ان گت بزرگ

”آپ نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔ I am so grateful to you.“

”Oh no, it was no problem at all.“ تم ہماری مہمان

تھیں۔ مہمان کا خیال رکھنا تو فرض بنتا ہے۔ ”وہ قدرے رکا، کچھ سوچا پھر مسکرایا۔“ ہائے
داوے بس! تمہارا یہاں نزول کیسے ہوا؟ کہاں سے آئیں؟ کس سلسلے میں آئیں؟“ وہ مسکرا
مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

وہ قدرے گڑبڑائی، پھر خود کو سنبھالا۔

”بڑی جلدی خیال آیا۔“ وہ مسکرا دی۔

”چلو دیر سے سہی بتا دو۔ کیوں آئی تھیں؟ کیسے آئی تھیں؟...“ اسکی آنکھوں میں شوخ

سی چمک تھی۔

وہ ہنس دی۔

”آپ تو یوں سب پوچھ رہے ہیں جیسے کوئی پریس رپورٹر کسی کا انٹرویو کر رہا ہو۔“

اور۔۔۔ فخر عالم کا جاندار تہہ بلند ہوا۔

”نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔ پریس رپورٹرز سے تو میں خود ارجح ہوں۔“

”اوہ۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔ ”اچھا اب چلتی ہوں۔“

”آپ میرا سوال گول کر گئی ہیں۔“

”آں۔۔۔ میں دراصل... نیچے گاؤں میں اپنی آنٹی کے پاس آئی تھی۔ آپکا جنگل سوشلی

یہ ڈیزیز والی ڈھلان۔“ اس نے اس ڈھلان کی طرف اشارہ کیا جس پر وہ دونوں اس وقت

کھڑے تھے۔ ”مجھے Fascinate کر گئی۔ سوچا پینٹ کر لوں۔ مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ

چند گھنٹوں کی جگہ کئی دن لگ جائیگی۔“

”ہوں؟“ اسکی گھنی ہنسی سوالیہ اور پراٹھ گئیں، آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی۔

”جی ہاں۔“ وہ مسکرائی۔ ”اچھا خدا حافظ۔“

اور۔۔۔ قریب ہی انہی بڑے بڑے پتھروں سے دریا پار کرنے لگی جن سے یہاں آتے

Day's Eye کہتے ہیں اسکو۔ ”وہ اس کے پھولے پھولے چہرے کو دیکھتا

مسکرا کر بولا۔

Day's Eye کا تو اسے واقعی علم نہیں تھا۔ ڈیزیز کہتے تھے سب۔

”اور تم جیسوں نے زیادہ لاڈ سے انہیں ڈیزیز بنا دیا ہے۔ پینٹ کر کے۔“

وہ ایک نظر اسکی پینٹنگ پر ڈالتے ہوئے آہستہ سے آگے بڑھ گیا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی پینٹنگ پر ڈیزیز بنائی اور تمام چیزیں سمیٹ کر کمرے میں

واپس آگئی۔

ناشتہ کیا۔ ٹھیک دس بجے ڈاکٹر نے آ کر ناکے کھولے۔ اور اب وہ جانے کو تیار تھی۔

اس نے اپنا مختصر سا سامان اکٹھا کیا۔ بیگ کندھے سے لٹکایا اور فخر عالم کے گھر کی

طرف چلی۔ اسکا شکر یہ تو اس نے بہر حال ادا کرنا تھا۔

وہ گھر میں نہیں تھا۔ جنگل میں کام دیکھنے گیا تھا۔ وہ وہیں چل دی۔ بڑے بڑے

درختوں کی مشینوں سے کٹائی ہو رہی تھی۔ ایک طرف تختے تراشے جا رہے تھے۔ پاس ہی

دریا میں درختوں کے کٹے ہوئے پانی کے بہاؤ کے رخ چلے جا رہے تھے۔

فخر عالم وہیں موجود تھا۔ بیچ کمر پینٹ اور جی رنگ کے فرکی لائیننگ والے جیکٹ میں

لبوں بہت ڈھنگ لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر پاس چلا آیا۔

”مسٹر فخر عالم! میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اور گھر جا رہی ہوں۔“ وہ خوشگوار لہجے میں

بولی۔ کچھ دیر قبل کی تو تو میں میں سب بھلا کر۔

”پتھر کھل گئے؟“

”بالکل کھل گئے۔“ وہ مسکرا دی۔

”ٹھیک۔۔۔ اب میں تمہیں روک نہیں سکتا۔“ وہ بھی مسکرایا۔

انکی بات کے تنازعہ میں اسکی مسکراہٹ میں، بے پناہ کشش تھی، جتنا طبعی قوت تھی۔

کاش! وہ اچھا آدمی بھی ہوتا!

آج ہوئے کراں کیا تھا۔

”خدا حافظ“۔ فخر عالم نے کہا۔

اور اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

وہ اس پار پہنچی تو غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ فخر عالم وہیں کھڑا تھا۔

ہاتھ سے اسے Wave کیا اور مڑ کر اپنے کام کی طرف جانے لگا۔

دھنک نے بھی ویو کا جواب ویو سے دیا اور تیزی سے آئی کے گھر کی طرف بڑھنے

لگی۔ آج شام کی ٹرین سے اس نے واپس جانا تھا۔

اس رات اسے آئی نے زبردستی روک لیا تھا۔ اگلے دن وہ شام کو ٹرین میں بیٹھی، وہی
دو دن کا سفر۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب وہ اپنے قلیٹ میں پہنچی۔
رات جوں توں کر کے آنکھوں میں کائی۔ اس پر عجیب سی خوشی، مانوگی سی سرشاری
طاری تھی۔

آج وہ آفس جا رہی۔ اشفاق انکل اس کا خط پا کر کتنے متحیر کتنے خوش ہو گئے۔ پھر ڈسکشن
ہوئی۔ اور اگلے دن میگزین میں بڑے بڑے حروف میں مسٹر فخر عالم کے متعلق سرخی چھپے گی،
دھنک کے نام کیساتھ!

اور وہ آصف کی بھی تو خبر لے گی۔ کیسے مسٹر فخر عالم کا سائڈ لیتا تھا۔ سرے سے اسے
مجرم گردانتا ہی نہیں تھا۔

”تم کیوں اسکے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہو۔ کورٹ نے فیصلہ دے دیا بس دے دیا۔ ضروری
ہے بہن قتل ہوئی تو بھائی بھی ختم ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے اسے آصف کے الفاظ یاد آئے۔
اچھا شرمندہ ہوگا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔

وہ صبح صبح تیار ہوئی۔ خاصی خنکی ہو رہی تھی یہاں بھی۔ گرمی دم توڑ چکی تھی اور سمسین بخ
بستہ ہو چکی تھیں۔ دن گھٹ رہے تھے اور شامیں سرد ہو چکی تھیں۔

موسم کی مناسبت سے اس نے رنگ برنگے پھولوں والے کپڑے پہنے، میچ کرتا دوپٹہ لیا،
ہلکا سا گرے رنگ کا بغیر آستین سویٹر پہنا اور گھنے خوبصورت ہالوں میں برش کرتے ہوئے
کندھے سے اپنا ہینڈ بیگ لٹکاتی لیکن میں فرزانہ کی طرف لگی۔

”قیامت اُٹھ رہی ہو آج۔ کس کی شامت آئی ہے؟“ فرزانہ اُسے تو صلی نظروں سے

REACTION
Section

دیکھتے ہوئے اسکے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے بولی۔

وہ دونوں صبح کے وقت ہوں ہی جلدی میں مگن میں ہی ناشتہ کر لیا کرتی تھیں۔

”آج بہت جلدی میں ہوں۔“ اس نے کپ ہونٹوں سے لگایا۔ ”واپس آ کر بتاؤ گی

سب۔“

”یعنی صبح کسی کی شامت آئی ہے؟“

”ہاں۔ وہ مسکرا دی۔“

”کچھ تو بتاؤ نا۔“ اسے تجسس ہوا۔

”کچھ نہیں۔“ سارا بتاؤ گی مگر آفس سے آ کر۔“ اس نے خالی کپ میز پر رکھا اور۔

دروازے کی طرف بڑھی۔

آفس پہنچ کر وہ سیدھی چیف ایڈیٹر کے آفس میں آ گئی۔

”السلام علیکم سر۔“ وہ خوش خوش بولی۔

”وعلیکم سلام۔ بیٹھو بیٹا۔“ انہوں نے اپنے سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”سناؤ

کیا حال چال ہیں۔ کچھ کامیابی ہوئی یا نہیں؟“ اپنے سامنے کی کھلی فائل بند کرتے ہوئے وہ تجسس نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

وہ کچھ الجھ سی گئی۔ پورا حال تو وہ خط میں لکھ چکی تھی۔ اور کامیابی؟ اس سے بڑھ کر

کامیابی کیا ہوتی تھی؟

”سر خط میں میں نے سارا لکھ تو دیا تھا۔“

”خط؟ کون سا خط؟“

کہیں مرزا ق کے سوڈ میں تو نہیں تھے۔

”سر پلیز! میں آپ کو کئی دن پہلے خط بھجوا چکی ہوں۔ اس میں میں نے ہر بات لکھ دی تھی۔

اپنے مشن میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں یا آپ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔“

”تمہارا فون آیا تھا وہ بھی کچھ احمور احمور سا۔ لیکن خط تو مجھے کوئی نہیں ملا۔“ وہ سنجیدگی

سے بولے۔

”میرا خط آپ کو نہیں ملا؟“ وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

”نہیں بیٹی۔ ملا ہوتا تو میں چھپاتا کیوں؟ ہاں یہ۔“ انہوں نے قریبی دروازہ کھولا۔ ”ابھی

ابھی تمہارے نام ایک خط آیا ہے۔“ انہوں نے خط کا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ تو ٹھیک ہے مگر میرا خط کہاں گیا؟“ وہ پریشان سی لفافہ کھولنے لگی۔

خط انگریزی میں لکھا تھا اور اس کا متن کچھ یوں تھا!

”میڈم رپورٹرا

تم میرے گھوڑے کے تاپوں میں آ کر گری تھیں تو مجھے سخت حیرت ہوئی تھی۔ میرے

علاقے میں کسی لڑکی کا کیا کام؟ اور وہ بھی بغیر کسی اطلاع یا اپوائنٹمنٹ کے۔ پھر تمہارے

قریب زمین پر گرا پینٹنگ برش دیکھ کر مجھے خیال آیا تم کوئی ٹورسٹ ہو، میرے قاعدے

اصولوں سے ناواقف ہو۔ یہ جنگل یا کوئی سینٹری تمہیں اچھی لگی تھی اور تم اسے پینٹ کرنے آئی

تھیں۔ مگر۔

چوٹوں کی تکلیف سے تم نے فنوڈگی میں جب امی امی پکارا تو سنس چونک اٹھا۔ یہ آواز

میں نے کہیں سنی تھی۔ کہاں؟ کسی طرح یاد نہیں آرہا تھا۔ سارا دن بار بار دماغ پر زور دیا۔ مگر

یاد نہیں آیا۔ جبکہ یہ بات اپنی جگہ مسلم تھی کہ تمہاری آواز میری سنی ہوئی تھی۔

میں محتاط ہو گیا۔ اپنے گارڈز اور ملازموں کو چوکنا کر دیا۔ اور پھر۔ اگلے دن میرا دوست

کامران آیا تو ہمیں ایک فون نمبر کی ضرورت پڑی۔ جو اس نے کچھلی بارگیٹ روڈ کے اسی

کمرے میں جہاں تم مقیم تھیں اپنے قیام کے دوران الماری حلیف میں بچھے اخبار کے ایک

کونے پر لکھا تھا۔ میں تمہارے کمرے میں آیا، دستک دی۔ کوئی جواب نہ پا کر میں سمجھ گیا تم

کہیں باہر ہو۔ نمبر چونکہ ہمیں بہت ضروری چاہیے تھا۔ اس لئے مجبوراً میں اندر گیا، سیدھا

الماری کی طرف۔ الماری کھول کر اخبار الٹ پلٹ کرنے لگا۔ نمبر بھی مل گیا مگر ساتھ ہی تمہارا

لکھا ہوا نوٹ بھی اور۔

رات میں نے اپنے ہاتھ روم کی کھڑکی میں سے تمہیں درخت پر چڑھتے دیکھا۔ روشنی مدھم مدھم تھی تمہارے ہاتھ میں نیپ ریکارڈر میں نے دیکھ لیا تھا۔ میں فوراً کمرے میں آیا کامران کو جلدی جلدی بات سمجھائی۔ میں شراب نہیں پیتا، صرف تمہیں دکھانے کو میں نے دو گلاسز میں کوک ڈالی، اسے بھی پکڑائی اور خود بھی گلاس تمام لیا۔ بہر حال تمہاری ہر مشکل میں نے اسی وقت حل کر دی۔ سمینہ میری بہن کے قتل کا اقرار بھی کیا۔ پھر فون کی تھنٹی بجی، ریسیور اٹھاتے ہی وہ آگے سے بند ہو گیا۔ تم نے دیکھا بھی ہوگا میں چند لمحوں ریسیور کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک خیال آیا قاتل تو سمجھتی ہی ہو سمگلر بھی سہی۔ میں بند فون پر ایک سمگلر کی ایکٹنگ کرتا رہا۔ رہی سلسلی والی بات تو وہ محض گپ تھا اور کچھ نہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تمہیں بیوقوف بنانے کیلئے میں کیا کیا نہ بنا؟

میری عین توقع کے مطابق تم نے خط مکمل کر کے قیوم کو پوسٹ کرنے دیا۔ وہ میں نے اس سے لے لیا۔ پوسٹ ہونے نہیں دیا۔ اور تم اپنا شیپ ریکارڈر بھی دیکھ لو۔ اہل میں ہلینک کیسٹ ہوگا۔ تمہارا والا میرے قبضے میں ہے۔ تمہارے کمرے میں آکر میں نے بدل لیا تھا۔ 'وہ قاتل ہے، سمگلر ہے، شرابی ہے، عورتوں سے کھیلتا ہے۔ اتنے بہت سارے اور اتنے خوبصورت Compliments کیلئے میں تمہارا مشکور ہوں۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر میں اتنا پست و ذلیل تھا تو تم کیسے یہاں حفاظت سے رہ پائیں؟

تمہیں چند روز قبل اخبار پڑھنے کو نمل سکا۔ اسی اخبار کی ایک کٹنگ اس خط میں بھیج رہا ہوں۔ تم پر واضح ہو جائیگا کہ اخبار میں نے کیوں روکا تھا۔"

خط چھوڑ چھاڑ اس نے اخبار کی کٹنگ جو میز کے نیچے جاگری تھی اٹھالی۔
 مسمینہ قتل کیس کے ملزم نے اقبال جرم کر لیا۔
 سرخی کے بعد اس نے تفصیل پر نظر دوڑائی۔

مسمینہ کا منگیتر جو اسکا ماموں زاد بھی تھا۔ مسمینہ کا قاتل تھا۔ واصل قاتل کا نشانہ مسمینہ کا بھائی مسز نخر عالم تھا۔ نخر عالم کو شتم کر کے وہ مسمینہ کے ذریعے تمام جائیداد کا واحد مالک بننا چاہتا تھا۔

مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا!

'کیا واقعی آپ بے گناہ ہیں یا آپکی بے پناہ دولت آپکو بے گناہ ثابت کرنے میں معاون ہوئی ہے؟ آپکی چپ کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ یہ قتل آپ نے ہی کیا ہے؟' طہر، عمارت اور زہرا گنتی یہ آواز میرا بچھا کر رہی تھی۔

میں نے تمہاری شکل تو نہیں دیکھی تھی پر تمہاری آواز میرے لاشعور میں محفوظ ہو گئی تھی اور اب میں سمجھتا ہوں کس مقصد سے آئی تھیں۔

میں نے نوٹ دیں رہنے دیا۔ کہ اب میں سب سمجھ گیا تھا۔ پڑھ کر کوفت تو ضرور ہوئی مگر اب میں اس انتظار میں تھا کہ تم کب اسے مکمل کرتی ہو اور کب پوسٹ کرتی ہو۔

میڈم تم نے رات کو لاش ٹرک میں ڈالتے دو آدمیوں کو دیکھا تھا۔ میں نے بتیاں بھی نہیں جھانکی تھیں، ٹورچ سے کام لے رہا تھا۔ ان میں سے ایک آدی کو لاش ٹھکانے لگانے رقم دی تھی ساتھ ہی کچھ ہدایات بھی تو۔

Madam Detective وہ لاش ان دو آدمیوں کی والدہ کی تھی۔ ہارٹ ٹیل ہونے سے فوت ہوئی تھیں۔ اور لایمپ اس وقت ٹیل ہوئی تھی میں بتیاں کیا جلاتا۔ ٹورچ اسلئے استعمال کیا کہ روشنی کی ضرورت تھی۔ آدی کو رقم اسلئے دی کہ وہ اپنے گاؤں پہنچ کر اپنی والدہ کی جھنجھوڑ مٹھن کر سکے۔ اپنے ہر بندے کی اس قسم کی ضروریات میرے ہی ذمے ہیں اسکے علاوہ کسی کو قتل کر کے لاش ٹرک میں دھکیلی جاتی ہے۔ سفید چادر سے ڈھانپ کر احرام کے ساتھ چارپائی پر نہیں رکھی جاتی۔ بہر حال۔ تمہارا قصور نہیں تم یقیناً اس وقت خونزدہ ہو گئی تھیں۔

پھر تم نے لکھا تھا۔ کہ تم اس انتظار میں ہو کہ کسی طرح تمہیں پر پتہ چل سکے کہ اپنی بہن کو میں نے ہی مارا ہے اور یہ کس دن تم انہیں فون بھی کرنے والی ہو۔

اب میں تو تمہاری حرکات و سکنات پر نظر رکھے لگا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا تمہارے فون کتنے وقت میں مسلسل وہاں موجود رہا تاکہ تم ایڈیٹر کو کوئی اطلاع نہ دے سکو۔ اور۔۔۔ اسی

READING
Section

”جب سے آئی ہو کچھ کھوئی کھوئی سی لگ رہی ہو کیا بات ہے۔“ فرزانہ اپنی چائے میں گچ چلاتے ہوئے اسکے چہرے کو بغور دیکھتی بولی۔
”آں۔ نہیں تو۔“ وہ گریزا سی مٹی۔

وہ واقعی اپنے حواسوں میں نہ تھی۔ وہاں کا قیام قدم قدم پر فخر عالم کی جاسوسی۔ اسکو فرانی اس کے رپورٹر ہونے کا علم ہو جاتا۔ دوست کیلئے فون نمبر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسکے نوٹس پڑھ لینا جو اس نے ایڈیٹر کو لکھے تھے۔ پھر جب وہ فون کرنے گئی تھی وہ بیڑے خوشگوار موڈ میں ملا تھا، مطلب اس کو سب پتہ تھا۔ پھر تمام وقت وہیں بیٹھے رہتا کہ وہ فون پر کچھ کہہ نہ سکے۔ رات کو اسے درخت پر چڑھنے اور بالکنی میں اترتے وقت اسکا فرانا اپنے دوست سے ساز باز کرنا، گلاس میں ڈرنک لینا، اپنی بہن کے قتل کا ذکر کرنا، بند فون پر سنگنگ کی باتیں کرنا، فرضی سہلی کا انتظار کرنا۔ اور۔۔۔

دھنک بھگتی رہی کہ اس نے میدان مار لیا۔

پھر۔۔۔ وہ پراسرار قسم کے کارڈز۔ انکی عجیب سی اسے گھورتی نظریں۔

دو دفعہ اسکے کمرے میں سے فخر عالم کی مخصوص پرفیوم کی مہک آتا۔ تب بھی وہ سمجھ نہ سکی کہ معاملہ کیا تھا؟ ایک بار وہ کمرے میں فون نمبر ڈھونڈتے اسکا ایڈیٹر کے نام ادھورا خط پڑھ گیا تھا۔ دوسری بار وہ کیسٹ لینے آیا تھا جس میں اسکی بظاہر ڈرنک ہو کر باتیں کرنے کا تمام ثبوت تھا۔

'By the way Miss! تمہارا یہاں نزول کیسے ہوا؟ کہاں سے آئیں؟ کس

سلسلے میں آئیں؟ وہ مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ بلکہ۔۔۔

اب سوچتی تھی تو اسکی مسکراہٹ میں ایک قانع کی سی شان تھی۔

'بڑی جلدی خیال آیا۔ اس نے کہا تھا۔

'چلو دیر سے کسی بتا تو دو۔ کیوں آئی تھیں؟ کیسے آئی تھیں؟ اسکی آنکھوں میں شوخ چمک

تھی۔

مگر بد قسمتی سے مسز فخر عالم کے بستر میں مس سینہ سو رہی تھیں۔ جنہیں چاقو سے پے لہ پے وار کر کے ختم کر دیا گیا۔

”بیٹی۔ مسز فخر عالم کی بہن کو تو اسکے منگیتر نے قتل کیا ہے۔ اخبار میں پڑھا ہوگا تم

نے۔۔۔“

ایڈیٹر اشفاق کی آواز پردہ چوکی۔

”جی... جی... ہاں۔“ خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے اس نے سرکری کی پشت سے نکالا۔

چند لمحوں کے بعد آگے بڑھتے ہوئے میز پر رکھے جگ میں سے پانی گلاس میں ڈال کر پینے لگی۔ شاید ایسے ہی حواس درست ہوں، کام کرنے لگیں۔

اس نے ہاتی کے خط پر نظر ڈالی۔

تم ایک رپورٹر ہو بجائے فیسے کے تمہاری یہ انا مجھے اچھی لگی۔ اسی لئے مجھے بھی یہ سب

کرنے میں حرا آرہا تھا، اچھا لگ رہا تھا سب۔

تمہاری جرنلزم امید ہے اچھی چاری ہوگی۔

خدا حافظ۔

کامل، منگل شرابی، دو دستائیز جو بھی سمجھو!

جانے ہاتی کا وقت اس نے آپس میں کیوں گزارا؟

ہماری ذہن، گھوٹے سر اور ڈانگے قدموں سے وہ کلیٹ پر پہنچی تو اپنا بیٹھ بیگ ایک

طرز اچھا اپنے بستر پر اونگھی پڑی۔

آگے کل تو شام کے سامنے کھبے ہو رہے تھے۔ موسم خوشگوار تھا اور سٹریٹ پر کے لپ

دش ہو چکے تھے۔

فرزانہ چائے بنا کر بیٹھی اسی کی خاطر تھی۔ وہ اٹھی جلدی سے ہاتھ روم گئی۔ منہ دھویا اور

ہاتھ آ کر فرزانہ کے سامنے وہابی کری پر بیٹھ گئی۔

فرزانہ نے اسکے کپ میں چائے ڈالی۔

گویا سے سب خبر تھی۔ پھر بھی اسکے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

’آپ تو یوں سب پوچھ رہے ہیں جیسے کوئی پریس رپورٹر کسی کا انٹرویو کر رہا ہو۔‘

وہ پریس سے تعلق رکھتی تھی۔ رپورٹر تھی۔ زبان پر بات آئی گئی۔

اسکا جائداد قبضہ اس وقت بھی اسکے کانوں میں گونجا۔

وہ جانتا تھا وہ رپورٹر تھی، جیسی تو دوسروں کی سیدھی بات میں بھی رپورٹنگ کا پہلو نظر آتا

تھا۔

’نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ پریس رپورٹرز سے تو میں خود الگ جگہ ہوں۔‘

’اوہ۔ وہ دیر سے مسکرائی تھی۔ دل میں سوچا تھا اسے کیا خبر رپورٹر اسکے سامنے

گھڑی تھی۔

”کچھ تو ہے۔“

وہ فرزانہ کی بات پر چونکی۔

”دراصل گھر گئی۔ بڑے مزے کے چند دن گزارے مگر آخری دن پاس پڑوس میں کسی

کا ایک بیڈنٹ ہو گیا۔ دو بندے ختم ہو گئے۔ بس وہی سب ذہن میں بسا ہوا ہے۔“ اس نے

بات بتائی۔

”چلو بس اب اور نہ سوچو۔ یہی ہے جس کو زندگی کہتے ہیں۔ انسان بے بس ہے کربھی

کیا سکتا ہے۔“ فرزانہ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

دراصل دھنک کنفیوزڈ تھی۔ سب الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ وہ کتنے طمطراق سے گئی تھی اور

بتا کیا؟

اسکے دل میں اس شخص کیلئے بے پناہ نفرت تھی۔ اسکے کروت اسے پاگل کئے دیتے

تھے۔ اکی ٹھاٹھاٹ، آن ہان ہشان شوکت سے اسے آگ لگتی تھی مگر۔

وہ تو ایسا نہیں تھا۔ بلکہ اسکے برعکس تھا!

بہر حال اس نے چائے پی۔ پھر فرزانہ کے ساتھ چند ضروری چیزیں خریدنے بازار چلی گئی۔

پلوں کی پائیلیس بجتی رہیں، دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں ڈھلتے گئے۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ وہی صبح رسالے کے دفتر جانا، گا ہے گا ہے اور ہر ادھر سے

رسالے کے لئے کچھ مواد جمع کرنا یہی گاؤں کی عورتوں کے مسائل پر، کبھی نوجوانوں کی بے

روزگاری پر، اور آجکل تو وہ خانہ بدوشوں کے خیموں میں جا جا کر بیٹھتی تھی ان پر فوج لکھنے کیلئے

۔ دوپہر دیر سے فارغ ہو کر فلیٹ پر آتی۔ مگر۔

اسکے روٹین میں ایک غیر محسوس سی تبدیلی آگئی تھی۔ دوپہر یا رات کو آرام کی غرض سے

بستر پر لیٹی تو چونک چونک اٹھتی۔ لے لے اونچے پائنز میں الجھے سفید بادل، ماکٹر کھر میں ڈوبا

گھڑی کا چھوٹا ساہل، اس پر کھبے میں لگی راستے کی نشاندہی کرتی فونگ لائٹ۔ گھڑی

گھڑی بارش، دھند، ٹھنڈ۔

اور۔ اور۔ کچھ اور بھی۔ ایک بے حد ہینڈسم، ڈشنگ ہیولا۔ اور۔

اس سے آگے وہ سر جھٹک دیتی۔ کہ وہ اتنا خوبصورت خواب دیکھنے کی قائل نہ تھی۔

سردی سے گرمی، اور اب ایک بار پھر رات بدل رہی تھی، راتیں بج بستہ اور دن چھوٹے

ہو گئے تھے۔ گلابی جاڑے ہمیشہ اسکے حواس تک میں اتر جاتے تھے۔ سردیوں میں وہ ایک

نا معلوم سی خوشی محسوس کرتی تھی۔

سفید شلوار، مسٹر ڈکٹر پر عذ قمیض اور مسٹر ڈو پنے کیساتھ ہمرنگ شوز پہنے وہ بس شاپ

پر گھڑی بس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

آج پھر امی کا خط آیا تھا۔ ایک بار پھر اصرار کیا تھا۔ وہی اسکی شادی کے سلسلے میں! چند

ماہ قبل بھی اسی رشتے کی امی نے بہت تعریف لکھی تھی مگر وہ صاف مگر گئی تھی۔ اب بقول امی وہ

READING
Section

میں۔ پھر ایسے میں ایک سائے کے پیچھے بھاگنا۔ اپنے دن راتوں کا سکہ چین گنونا۔ مگر کیا یہ سب اسکے بس میں تھا؟

لوگ ایک دفعہ پھر آئے تھے۔ پھر اصرار کر رہے تھے۔ مگر۔
جانے کیا بات تھی؟ اسکا دل مانتا ہی نہیں تھا۔ وجہ کیا تھی؟ شاید رسالے کی رپورٹنگ بذات خود بلکہ صحافت بذات خود ایک بہت دلچسپ چیز تھی اور وہ اس سے وابستہ رہنا چاہتی تھی۔ پھر وہ سوچتی کیا اتنا ہی تھا؟ مگر۔

جب ایمانداری سے دل ٹٹولتی تو یہ بات دوسرے درجے پر نظر آتی۔ کچھ اور تھا جو شادی میں مانع آرہا تھا۔ سال بھر قبل واقعی وہ صحافت کو اولین درجہ دیتی تھی مگر اب۔
اب جیسے کوئی اور بات تھی!

معاں نے دیکھا سامنے سے ایک گاڑی آرہی تھی۔ ڈرائیور گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور کچھلی سیٹ پر فخر عالم بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی ایک لڑکی بھی۔
پہلے تو اسکے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہوئیں، آنکھوں میں قدیلے سی جل اٹھیں۔
مگر۔

دوسرے ہی لمحے کھلے ہوئے چہرے پر یاسیت چھا گئی، آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ شاید فخر عالم کو دیکھ کر اسے خوشی ہوئی مگر اس کیساتھ کسی لڑکی کو دیکھ کر وہ مایوس ہو گئی تھی۔
بہر حال۔ اس نے رخ دوسری طرف کر لیا۔ جیسے اس نے دیکھا ہی نہ ہو۔ گاڑی گزر گئی اور وہ اسکی دھول کو بکھتی رہ گئی۔

بس میں بیٹھنے لگی تو پاؤں جیسے من من کے بھاری محسوس ہوئے اور۔ وہ دل سے یہ سوال کئے بنانہ رہ گئی۔ کیا وہ فخر عالم کو چاہنے لگی تھی؟

دن سونے سونے راتیں بے کیف کتنے لگیں۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ ایک سائے کیلئے بے قرار رہنے لگی تھی۔ اس کیساتھ بیٹھی لڑکی کو خود اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا پھر بھی دل تھا کہ بے قابو ہو رہا تھا۔

وہ اپنے دل کو بہت سمجھاتی۔ کہاں وہ بھلوانی میں رہنے والا۔ کہاں دھنک، ایک ٹل کلاس لڑکی اور فخر عالم کیساتھ وہ لڑکی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ دونوں کی انڈر شیڈنگ تھی آپس

سو سائے
ڈاکٹ
کام

مگر وہ چلتی گئی کہ اسے کچھ عادت سی ہو چلی تھی۔ بارشوں کی، بادلوں کی اور بے حساب شخص کی۔

معا ایک جیب پاس آ کر رکی۔
"آؤ۔"

اس نے دیکھا فخر عالم تھا۔ ڈرائیو بگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ہاتھ اسے سہارا دینے کو آگے بڑھایا تھا۔

بغیر کچھ سوچے سمجھے جیسے کوئی مقناطیسی کشش تھی جو اسے کشاں کشاں جیب تک لے گئی۔ فخر عالم کا آگے بڑھا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جیب آگے بڑھنے لگی۔

"تمہیں چھتری لے کر نکلتا چاہیے تھا۔ یہاں کی بارش کا کچھ پتہ نہیں چلتا کب شروع ہو۔" وہ سڑک پر نظریں جمائے تھا۔ وہ خاموش رہی، کہتی بھی کیا۔

اس وقت تو بس دل تھا کہ زور زور سے دھڑکے جا رہا تھا۔ وہ اس شخصیت کے نزدیک بیٹھی تھی جسے وہ سن ہی سن میں کتنے عرصے چاہتی آرہی تھی۔ فخر عالم بھی اسکی کیفیت سے آگاہ تھا یا نہیں یہ اس نے ضروری ہی نہیں سمجھا۔

"مادام جرنلسٹ۔ کیسے حال چال ہیں۔" اب بھی وہ ہی خوشگوار سے بولا۔
"ٹھیک ہوں۔"

کچھ ٹاپے وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

"کبھی مجھے بھی یاد کیا تھا اتنے عرصے میں۔" وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ دھنک اسکے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکی۔

"نہیں تو۔" اس نے خالص جھوٹ بولا۔

"کر لیا ہوتا تو کیا چلا جاتا تمہارا۔ مجھے تو تم اکثر یاد آتی رہیں۔" رخ پھیر کر اس نے

سردیاں گزر گئیں، گرمیاں آئیں اور خوب زور شور سے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے لگتا تھا پھل جانیگا بندہ۔

ایسے میں اچانک امی کا فون آ گیا۔

"چہرہ کی چھٹی لے کر پہاڑ پر پہنچ جاؤ، ہم لوگ آج ہی جا رہے ہیں۔"

خوشی تو اسے ہر بار ہوتی تھی مل سٹیشن پر جانے کی مگر۔ اس بار خوشی کچھ نرالی تھی، انوکھی تھی!

اس نے فوراً ہی چھٹی کی درخواست دے ڈالی۔ جو منظور ہو گئی۔

اور وہی دن بعد وہ اپنے امی ابو اور بہنوں تسلیم اور نسیم کیساتھ تھی۔ ان سب کو پا کر اسے تعویت کا احساس ہوا کہ دل۔ جواب اسکا نہیں رہا تھا اپنوں کو پا کر اپنے وجود کا احساس تو ہونے لگا تھا۔ ورنہ ہاں تو وہ ایک خالی خول کی مانند تھی۔ خالی خالی نظریں، بھٹی بھٹی سی روح! شام کو اسکی آنکھ کھلی تو پانچ بج رہے تھے۔ فلیٹ میں کوئی نہیں تھا۔ شاید واک کرنے یا پارک میں نکل گئے تھے۔

انھ کس نے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ کپڑے بدلے، بال درست کئے۔ اور۔ لپے پسندیدہ چھوٹے سے کٹری کے کھوکھے والے ہوٹل میں چائے پینے باہر نکل آئی۔ آسمان پر سیاہ اہل منڈلا رہے تھے، نیچے کھائی میں اتنی کہ تھی کہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، سردی اتنی تھی کہ ایک سوٹ ناکانی ہو رہا تھا۔

بہر حال وہ آگے بڑھنے لگی۔ چکر دار سڑک کی گولائیوں پر چلتی چلی گئی۔

اچانک ٹپ ٹپ موٹی موٹی بوئیں پڑنے لگیں۔

“No, I mean it. You are going to be the very first reporter to have my interview.”

”اتنے مہربان کب سے ہو گئے۔“

”جب سے تمہیں دیکھا تھا...“

وہ لڑکی۔ اسے پھر خیال آیا۔ فلٹ تھا یہ یونانی دیوتا!

جیب دریا پر سے ہل کو کراس کرتی اسکے علاقے میں داخل ہو گئی۔ وہی جنگل تھا پچھلے

سال ڈیڑھ سال والا۔ اسی میں میٹر ہا میٹر حاراستہ تھا جس پر جیب آگے بڑھ رہی تھی۔

وہی لکڑی کا مکان تھا، وہی اسکے آگے چھوٹا سا لکڑی کا ہل، وہی گھر کے پیچھے والی

مصنوعی جمیل میں سے آکر ہل کے آگے آبشار کی صورت میں گرتا پانی۔ لکڑی کا جھونپڑا نما مکان

اب بھی درختوں اور سبزے میں گھرا تھا، اوپر کی بالکنیوں میں سے اب بھی ان گت سرخ پھول

جھول رہے تھے، مکان کی ڈھلانی چھت آج بھی سرخ پھولوں سے ڈھکی تھی اور۔۔۔ قدم

قدم پر خود رو ڈیزیز اس وقت بھی سر اٹھائے نرم خرام ہوا میں جھوم رہے تھے۔

جیب آگے چل کر بائیں جانب پورچ میں رک گئی۔ کئی ملازم اب تک چوکنے ہو گئے تھے۔

فخر عالم کیساتھ ساتھ انہوں نے دھنک کیلئے بھی دروازہ کھولا۔ ان کے چہرے جانے پہچانے

تھے۔ اسے دیکھ کر خوش لگ رہے تھے۔ جیسے اچھا لگا ہوا نہیں اس کا آنا!

فخر عالم اسے اسی ہال میں لے گیا جہاں قریباً ڈیڑھ سال قبل وہ فون کرنے آئی تھی۔

پھر اس سے ملحقہ قدرے چھوٹے لاؤنج میں۔ یہاں گداز قالین پر قیمتی صوفے لگے تھے۔

ہر طرف کھڑکیاں تھیں۔ پردے ہٹائے گئے تھے اور باہر بادل میں لپٹے پائیز چپ چاپ

کھڑے موسلا دھار بارش کے تھپڑے سہ رہے تھے۔

”تم بیٹھو۔ میں چنچ کر کے آتا ہوں۔“

وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا چلا گیا۔

اور دھنک چوڑی کھڑکی کے پاس لگے صوفے پر بیٹھی سامنے کے نظاروں پر نظر میں جمائے

دھنک کو دیکھا۔
تو سقزج کے تمام رنگ دھنک کے چہرے پر چھائے۔ سیاہ جھالیں ہلکیں جھک گئیں۔

نازک ہاتھ کانپ سے گئے۔

”کیوں؟“ اس نے ہمت مجتمع کی۔ سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔

”اس کیوں؟“ کا مجھے خود بھی اب تک پتہ نہ چل سکا۔“

معاذ دھنک کو خیال آیا اس کیساتھ اس لڑکی کا مگر۔ ذکر نہ کیا۔ بات دل ہی میں رہے ہوئی۔

اس نے دیکھا چھوٹا سا بازار نیچے رہ گیا تھا اور وہ اوپر ہی اوپر بڑھ رہا تھا۔

”میں نے تو بازار میں اترتا تھا۔“ وہ بول پڑی۔

”کیا کام ہے بازار میں۔“ اطمینان سے کہتا وہ چلا ہی گیا۔

”پلیز!“

”بتاؤ نا کیا کام ہے بازار میں۔“

”چائے چینی تھی۔“

”اوہ۔۔۔ وہ خوبصورتی سے مسکرایا۔“ چائے نہیں۔ کوئی نہیں گے۔۔۔ دونوں مل کر

میرے گھر میں...“

”پلیز! اچھا نہیں لگتا۔ آپ کے ملازم وغیرہ کیا سوچیں گے۔“

وہ زور سے ہنس دیا۔

”اور وہ پہلے جو آئی تھیں۔“

”دو... دو تو میرے پروفیشن کا تقاضا تھا۔“ وہ بھی ہنس دی۔

”ابھی تو تب بھی معلوم نہیں تھا کہ تم اپنے پروفیشن سے آئی ہو۔“

”پتہ نہیں کیوں اب کے بغیر کسی مقصد کے جانا... گھٹی سا محسوس کرتی ہوں۔“

”ایسا کرو۔ تم میرا ٹرو پولو۔“

لہذا نہ چاہتے ہوئے بھی دھنک کلکلا کر ہنس دی۔

REMARKS
Section

فخر عالم کا رنگ بدل سا گیا۔ چہرے پر ناگوار سے تاثرات ابھرے۔
 ”ہاں“۔ اس نے اتنا ہی کہا۔ پھر سامنے کے پائیز پر نظریں جمادیں۔
 تبھی پیرا دونوں کیلئے کوئی لا کر درمیان والی میز پر رکھ گیا۔ ساتھ میں چیز سینڈویچز اور
 ہنٹر بیف۔

فخر عالم نے دھنک کیلئے کوئی بنائی۔ دودھ اور چینی ملا کر اسکے آگے کھسکایا۔ اور اپنے
 لئے صرف کوئی ڈال کر اوپر سے ابلا پانی انڈیلا اور چھچھلا کر۔ تلخ کھونٹ حلق سے
 اتارنے لگا۔

دونوں خاموشی سے اپنی اپنی کوئی پینے میں مصروف تھے۔
 دیکھتے ہی دیکھتے بارش ختم گئی۔ درخت دھلے دھلے لگنے لگے اور۔ مطلع صاف
 ہونے لگا۔

”یہ اونچے اونچے درخت بارش میں دھل کر کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔“
 ”مجھے تو وہ۔ سامنے والی رین بوا اچھی لگ رہی ہے کس رین بوا۔ اس نے بڑی سی
 جگہ پر محیط رنگ برنگے رین بوا کی طرف اشارہ کیا۔
 وہ مسکرا دی۔ دھیرے سے۔

”مگر اس رین بوا سے یہ والی رین بوا زیادہ پیاری ہے کیوں؟“ اندر رخ کرتے ہوئے
 اس نے دھنک سے کہا۔
 وہ مزید مسکرا دی۔

”تمہارے دانت بہت خوبصورت ہیں۔“ وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔
 دھنک چپ سی نظر آنے لگی۔ پورا ڈیڑھ سال تو جانے کہاں کہاں قمرٹ کرتا رہا۔ آج
 وہ نظر آگئی تو اسے بنانے لگا۔

”مجھے مزہ دیکھے کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔“ دھنک نے اب بھی مسکراتے ہوئے کہا۔
 فخر عالم نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اسکے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس کے متعلق سوچنے لگی۔

وہ کیوں اسے یہاں لایا تھا؟
 ”مجھے تو تم اکٹریا آتی رہیں۔“
 ”کیوں؟“

”اس کیوں؟“ کا مجھے خود بھی اب تک پتہ نہ چل سکا۔
 اس کی باتوں میں اشارہ تھا۔ اس کیلئے پسندیدگی کا مگر۔
 صرف پسندیدگی سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو اسے چاہتی تھی بے تحاشہ۔
 دلچسپ اور آگیا۔

لاہیٹ گریٹ شلوار لیمنس اوپر سے اسی رنگ کا نرم اور قیمتی سویٹر۔ پاؤں میں چمپل۔ جیسے
 ریلیکس ہونا چاہتا تھا۔

قریب آ کر وہ اس کے مقابل والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
 ”تم خاصی بھیک مٹی ہو۔“ وہ تشویش سے بولا۔ پھر مسکرایا۔ ”میرے کپڑے پہنو گی؟“ وہ
 جیسے یوں ہی کہہ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ ایسا نہیں کرے گی۔

”نہیں۔“ وہ بھی مسکرا دی۔ ”میں اتنی نازک نہیں کہ بارش میں بھینکنے سے بیمار پڑ جاؤں۔“
 ”اوہ۔“ وہ جیسے دل ہی دل میں اس پر ہنسا۔ نازک تو وہ خاصی تھی، ہاں بولڈ ضرور تھی۔
 ”آپ... آ کہاں سے رہتے تھے؟“ دھنک نے یوں ہی پوچھ لیا۔
 ”شہر سے۔ گری تھی وہاں۔ مگر پرسوں واپس جاؤں گا چند دن کیلئے۔“

شاید اس لڑکی کیلئے دھنک نے سوچا۔
 ”میں نے آپ کا ایک بار دیکھا تھا گاڑی میں گزرتے ہوئے۔“
 ”کہاں؟“

”وہیں شہر میں ایک لڑکی بھی تھی آپ کے ساتھ۔“ ہاں جو دکوشش کے اسکے لہجے میں شکوہ
 سا لہرا آیا۔

”یہ منہ دیکھے کی باتیں نہیں ہیں۔ تم مجھے اکثر یاد آئیں۔ یقین نہ ہو تو میری ڈائری میں اپنا ایڈریس دیکھ لو۔ تمہارے گھر کا ایڈریس۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے قادر انگلش ڈیپارٹمنٹ کے چیرمین ہیں۔ تمہاری دو بہنیں اور ہیں۔ ان کے نام تک مجھے پتہ ہیں... لیکن — وہ حیران ہی اسے دیکھ رہی تھی۔

”لیکن کیا؟“

”میری کچھ مجبوریاں تھیں، بلکہ ہیں۔ جن کی وجہ سے میں تمہیں مل نہیں پایا۔“

”اور آج؟“ وہ اب بھی حیرت زدہ تھی۔

”آج تو خدا نے سن لی۔ تمہیں خود بخود لاڈالا میرے پاس۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

اور دھمک باقی کی کوئی پیچھے ہونے اسکی باتوں پر غور کرنے لگی۔

”تم یہاں کتنے دن رہو گی؟“ فخر عالم نے خالی گک میز رکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہی آٹھ دس دن۔“

”اوہ۔ پھر تو میں شہر سے جلدی واپس آؤنگا۔“ وہ مسکرایا۔

”کیوں؟“

وہ ویشیسی آنکھوں سے اسکی آنکھوں میں جھانکا۔

”اسلئے کہ یہاں تم ہو۔ اسلئے کہ یہاں میں تمہیں ملتا رہوں گا اور — اور اسلئے کہ میں تم

سے پیار کرتا ہوں... کچھ اور پوچھتا ہے؟“

وہ اب بھی اسکے جھکے سر ہر رخ چہرے اور کانپتی لرزتی پلکوں کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ... وہ لڑکی کون تھی؟“ کا نانا تو اسکے دل میں چھایا تھا۔

”انہو — بھول کیوں نہیں جاتی ہو اس لڑکی کو۔“

”کیسے بھول جاؤں؟“ وہ پھولے پھولے منہ کیساتھ بولی۔

”جیسے میں بھول گیا ہوں۔“

دھمک کو ایک گونہ تسلی ہوئی۔

”کون تھی وہ؟“ وہ شاید اپنی حرید تسلی کی خاطر بولی۔

”تھی بس کوئی۔ اور آئندہ تم اسکا ذکر نہیں کرو گی۔“

اس نے بات ہی ختم کر دی۔ اسے بھی اور زیادہ کریدنا اچھا نہ لگا۔ ٹھیک تھا جو بھی تھی

اسکی۔ اب تو نہیں تھی نا۔

وہ مطمئن سی نظر آنے لگی۔

تھوڑی دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔

”اب پلیز مجھے چھوڑ آئیں۔“ کوئی کا خالی گک اس نے میز پر رکھ دیا۔

”چھوڑ آؤنگا ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“

”اندھیرا ہو چکا ہے...“ وہ کھڑکی میں سے چھوٹے چھوٹے گھروں کی ٹوٹی ہوئی چیموں

کو جھگ جھگ کرتے دیکھتے ہوئے بولی۔

فخر عالم نے ہاتھ بڑھا کر لائیٹ آن کر دی۔

”کہاں ہے اندھیرا؟“

”نفاق نہیں۔ پلیز! وہ دیکھیں سارا گاؤں بتیاں جلا چکا ہے۔“ وہ کچھ ان ایزی سی لگ

رہی تھی۔

”تم وہی ہو جو راتوں کو درختوں پر چڑھتی تھیں...“

وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

”اب شاید میں بزدل ہو گی ہوں۔“

”پیار میں ایسا ہوتا ہی ہے۔“

”کافی تجربے کا رنگتے ہیں آپ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تھوڑا تھوڑا — کبھی کبھار...“

اور وہ چل پڑی۔

فخر عالم نے جھٹ سے اسکا ہاتھ پکڑ لیا۔

”یاد ذاق بھی نہیں سمجھتی ہو کیا چیز ہو“

”یہ مذاق نہیں ہے“

”اچھا نہیں ہے۔ اس کی شکل مسکین ہوگئی۔“

”آئندہ میں نے کسی لڑکی کو آپ کیساتھ دیکھانا تو...“

”تو۔ کیا کروگی؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”ماروگی میں۔“

”کس طرح؟“

”اس طرح۔“ کوپتا ہاتھ چمڑا کر اس نے ہلکا سا مکا اسکے مضبوط سینے پر دے مارا۔

اسکا نازک سا دارا سے اچھا لگا، محفوظ ہوا، اٹھ کھڑا ہو۔

”چلو نیم۔ تمہیں چھوڑ آئیں۔“

دونوں لالوچ سے باہر آگئے۔

اسے ٹھنڈ لگ ہی گئی۔ دو دن خاصا بخار رہا۔ آج کچھ بہتر تھی۔ دوپہر کو جو سو کر اٹھی تو شام کے سائے میا لے ہو رہے تھے۔ اٹھ کر اس نے ہاتھ روم میں منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ گرے پر بیٹھ کر گرم کپڑے پہنے۔ گرے لیدر کے شوز اور گرے ہی جیکٹ پہنی۔ اپنی پسندیدہ پرفیوم لگاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔

دیکھا کوئی نہیں تھا سوائے ابو کے جو برآمدے میں کرسی پر بیٹھے اطراف کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”ابو سب لوگ کہاں ہیں؟“ اس نے ابو سے پوچھا۔

”بیٹے نیچے گئے ہیں گھومنے۔ تمہیں اسلئے نہیں جگایا کہ خواہ مخواہ ڈسٹرب ہوگی۔“

”ابو میں بھی جاتی ہوں نیچے۔ اُنکا فلیٹ کافی اونچائی پر تھا۔“

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گنے پنے مکان اور ضروری اشیاء کی چند دکانوں پر مشتمل۔ یہاں کسی کے گم ہونے یا پھرا کیلئے جانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ نیچے جاتی تو امی اور تسلیم اور سلیم سبھی کہیں نہ کہیں نظر آتی جاتیں۔ یاد آک کر رہی ہوگی یا چھوٹے سے پارک میں جھولوں ہی سا وغیرہ میں مصروف ہوگی یا پھر سب کی پسندیدہ چائے سوسے اور پکوزوں کے چھوٹے سے لکڑی کے کھوکھے میں لکڑی کی میچ پر بیٹھیں سوسے یا پکوزے کھا رہی ہوگی۔

اسکا بھی دل چاہا۔ اسی کھوکھے سے چائے پینے کو۔ فائو سٹار ہوٹلوں کی بیالی بھاری اور

چائے ہلکی ہوتی ہے۔ مگر ان کھوکھوں کی بیالی ہلکی سی چائے زبردست ہوتی ہے۔

جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے وہ سوچوں میں گم چلی جا رہی تھی۔ ابھی اوپر ہی تھی کہ

چونک پڑی۔ نیچے سڑک پر فخر عالم اپنی جیب میں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ تو واقعی وہ جلد

لوٹ آیا تھا۔

اسے عجیب سی خوشی کا احساس ہوا، انوکھی طمانیت کا!

بازار پہنچ کر وہ اپنی پسندیدہ دکان میں بیچ پر بیٹھ گئی۔ دکاندار نے لکڑی کی میٹلی سی میز میلے سے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے اس پر اسکے سامنے چائے رکھی۔ وہ چھوٹے سے بازار میں شام کی پہل سے محفوظ ہوتی گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پی رہی تھی۔

تجھی۔ وہاں فخر عالم آ گیا۔ گرے کٹر پیٹ پر اسی کے ہمرنگ فرکی لائیٹنگ والا ہاف لینتہ قیمتی رین کوٹ پہنے وہ ہمیشہ کی طرح شاندار لگ رہا تھا۔

”صاحب آپ کیسے ہم غریبوں کی دکان پر آ گئے۔“ بوڑھے دکاندار کا چہرہ خوشی سے

چمک رہا تھا۔

”نہیں بابا۔ ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل مجھے کام سے وقت نہیں ملتا۔“ وہ دکاندار کی

عمر کی وجہ سے مؤدب طریق سے بولا۔

”کیا لاؤں سرکار؟“

”چائے۔“

دکاندار چائے بنانے لگا۔

”اور میم صاحب تم یہاں کیا کر رہی ہو۔“ وہ اس کے مقابل بیچ پر بیٹھ گیا۔

”چائے پی رہی ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔ تمہیں ہی یہاں دیکھ کر تو میں آیا ہوں۔ وہ اوپر۔“ اس نے

اشارے سے دکھایا۔ ”سڑک سے گزر رہا تھا تو نیچے تم نظر آ گئیں۔ گھر پہنچے ہی واپس چلا آیا۔

مگر تم۔“ چائے یہاں کیوں جیتی ہو۔“ اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ بازار کے بیچ بیٹھ کر چائے

پینا۔ چند دکانیں وہ بھی جانی پہچانی۔

وہ مسکرائی۔

”روز تو نہیں جیتی۔ کبھی کبھار آ جاتی ہوں۔ اچھا لگتا ہے مجھے۔ اور پھر ہم تو رٹس کو یہاں

کون جانتا ہے...“

اسکی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے فخر عالم نے گہری سانس لی۔ پھر وہ بھی مسکرا دیا۔

اسکی چائے آ گئی۔ بڑے بڑے گھونٹ لے کر فوراً ہی پیالی خالی کر دی۔

”آؤ۔“ اٹھتے ہوئے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

دھنک نے اسکا ہاتھ تمام لیا مگر۔

”کہاں؟“

”بازار سے باہر نکل کر گھومیں گے۔“

اور دھنک نے اچانک امی، تسلیم اور نسیم کو وہاں سے گزرتے دیکھا۔ جلدی سے ہاتھ

اسکے ہاتھ سے نکال لیا۔

”امی ہیں۔ بہنیں ہیں میری۔ اچھا میں چلتی ہوں۔“ وہ کچھ سٹ پٹائی سی لگ رہی تھی۔

دھنک نے فخر عالم کے منع کرنے کے باوجود دونوں کی چائے کی پے منٹ کی۔

”خدا حافظ۔“ اس نے کہا۔

اور دکان سے باہر نکل کر ان لوگوں سے جا ملی۔

فخر عالم۔ دیکھتا ہی رہ گیا۔

اور وہ شورٹ کٹ سے ہوتی اسی جگہ آگئی جہاں قریباً نو سال قبل اس نے سبکی دریا پار کیا تھا۔ بڑے بڑے پتھر اب بھی موجود تھے۔ کتے ہوئے درختوں کے تنے اب بھی پانی کے بہاؤ پر رواں دواں تھے۔

وہ احتیاط سے پتھروں پر قدم جھاتی دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔

فخر عالم وہیں کھڑا تھا۔ اونچا قد، چوڑے شانے، گندی صحت مند رنگ، پرکشش نقوش، گھنی سیاہ مینوئیس، سیاہ چمکتی آنکھیں۔ سیاہ قیمتی سوٹ زیر تن کے مشابہتہ انداز! اسے وہ کسی دیومالائی کہانی کا شہزادہ لگا۔

”Happy birth day sir.“ اس نے مسکراتے ہوئے فخر عالم کی طرف

پھولوں کا خوبصورت گلہستہ بڑھایا۔

”تھینک یو نیم۔“ فخر عالم نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

ایک ہاتھ سے اس نے Bouquet پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اسکا تازک ہاتھ

تھام لیا۔

”یاد ہے کچھ عرصہ پہلے یہاں کیسے آکر لڑھکی تھیں۔“ اس مخصوص جگہ سے گزرتے

ہوئے فخر عالم نے مسکراتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

”مگر آج تو میں لیگل طور پر آئی ہوں چوری سے نہیں۔“

”لیگل آ جاؤ تا دھنک پلیز!“ اس نے اس کے ہاتھ میں تھامے ہاتھ پر اپنے پرکشش لب

رکھ دیئے۔

دھنک کے رگ و پے میں سنساہٹ سی دوڑ گئی۔

سیاہ خمیدہ پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

اسکا یہ روپ فخر عالم کو مسحور کر گیا۔

اسکا ہاتھ تھامے تھامے وہ اسے گھر کے اندر لے گیا۔

آج بھی بڑے بڑے ہال میں قیمتی کرسٹل کے بڑے بڑے فالوس ہال کو خوبصورت بنا

دن کے دس بج رہے تھے۔ وہ اپنے گھر کے چھوٹے سے برآمدے میں منجھی مدمحوپ سے لطف اندوز ہوتی آجکا تازہ اخبار پڑھ رہی تھی۔

تجھی اس نے دیکھا۔ نیچے ایک کار آ کر رک گئی۔ اس میں سے برآمد ہوتا ڈرائیور اگلی پلڈ ٹری پر چلتا ہو پرایا۔ نہایت ادب سے اسے ایک بڑا سا سفید لفافہ تھمایا۔

”میڈم۔ یہ مسٹر فخر عالم نے آپ کے لئے دیا ہے۔“

وہ شاید اسے جانتا تھا۔ مگر دھنک نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ واپس چلے گیا۔

دھنک نے لفافہ کھولا۔ Invitation تھی فخر عالم کی برتھ ڈے کی۔ اور جسے بقول

فخر عالم صرف وہ دونوں منانے جا رہے تھے۔

شام ٹھیک چار بجے وہ تیار ہوئی۔ ڈارک گرین کپڑوں میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

اپنے جینی براؤن سٹریٹ خوبصورت بالوں میں برش کیا۔ کپڑوں کے ہمرنگ دوپٹے، لیڈر کے شووز

پہنے اور امی کے پاس کچن میں آگئی۔

”امی میں جاؤں دیر ہو رہی ہے۔“

اس نے صبح ہی اپنے کسی کولیگ کی سالگرہ کا کہہ کر امی سے اجازت لے رکھی تھی۔ جانے

کیوں فخر عالم کا براہ راست نہ کہہ پائی تھی۔ گوامی نے یہاں بھی اعتراض نہیں کرنا تھا کہ اسکا

پروفیشن ہی ایسا تھا۔ مردوں سے بلا جھجک ملنا، بات چیت کرنا۔

”ہاں بیٹا۔ مگر جلدی واپس آنا۔“

”اچھا امی۔“

READING
Section

میں بھی اچھی ہی تھیں میرے ساتھ بس ڈانٹتی ذرا زیادہ تھیں۔ "وہ اداس سا مسکرایا۔" پھر میری ایک سوٹ سی بہن پیدا ہوئی۔ ہم دونوں کی عمروں میں تقریباً چار پانچ سال کا فرق تھا۔ سمینہ سوتیلی تھی پر کون کہہ سکتا تھا کہ ہم سوتیلی ہیں۔ بڑے پیار سے رہتے تھے ہم لوگ۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں بابا نے مجھے پڑھائی کیلئے سویٹزر لینڈ بھیج دیا۔ وہیں تھا میں جب ممی کے فوت ہونے کی خبر ملی۔ امتحان شروع تھے میں آنہ سکا۔ میں ڈنئی طور پر بہت ڈسٹربڈ تھا۔ سمینہ کے دکھ کا میں اندازہ کر سکتا تھا۔ بہر حال میری پڑھائی جاری رہی۔ پھر پڑھائی کے بس آخری دن تھے۔ Exam's شروع تھے۔ کہ بابا کے ڈیجھ کی اطلاع ملی۔ آخری ہیچہ دیتے ہی میں پاکستان چلا آیا۔ سنا ہے انہیں زہر دیا تھا کسی نے۔ بہر حال۔ میرے آجانے سے سمینہ کو ڈھارس ہوئی۔ ہم دونوں بہن بھائی اپنا وقت کاٹ ہی رہے تھے کہ اچانک۔ میری

جگہ اسے ختم کر دیا گیا۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا!"

اس نے گہری سانس لی۔ دکھ سے مسکرایا۔

"اپنے ساتھ تمہیں بھی پریشان کیا ہے۔" اسکی آواز میں گہری گھمبیر تھی۔ اداسی اور دکھ اسکی آنکھوں تک میں اتر آئے تھے۔

دھنک کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیسے تسلی دے۔

"آپ... آپ پریشان مت ہوں... پلیز!"

اور جی۔۔۔ یہ ایک بہت بڑا فارسٹ کیک اٹھائے اندر آ گیا۔

مؤدب طریق سے دھنک کو سلام کیا۔ اب یہ سب لوگ اسے اچھی طرح جان گئے تھے۔

کیک میز پر رکھے ہوئے وہ بے قدموں واپس چلے آیا۔

پھر لیٹ ب روست، پلیٹڈ چکن روست، مشن تک، بیج کباب، پیو، چیز سینڈویچز وغیرہ

بھی آ گئے۔

صرف وہ دونوں تھے۔ پھر عالم نے موسم ہی ہلائی۔

آج وہ تیس سال کا ہو گیا تھا۔

رہے تھے، دیواروں پر لگی بیش قیمت پینٹنگز اپنے مکین کے ذوق کا پتہ دے رہی تھیں، بیش بہا مجسمے ہال کی زینت بڑھا رہے تھے اور۔۔۔ اوپر جاتی چوڑی کارپینڈ میٹھیوں کے پاس رکھا بڑا سا پیا نو ہال کی رونق میں اضافہ کر رہا تھا۔

دیوار پرانی قالین پر چلتے دونوں اسی دن والے بغل کے لاؤنج میں آ گئے۔ سالگرہ کے آثار کوئی نہ تھے۔ شاید وہ یوں ہی سادگی سے اپنی سالگرہ منایا کرتا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے مقابل چوڑی کھڑکی کے قریب صوفوں پر بیٹھ گئے۔

باہر ہمیشہ کی طرح فطرت اپنا حسن لٹا رہی تھی۔ قریب کے اونچے پہاڑ سر بلک درختوں

میں بادل دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ ہر طرف پہاڑ اور درخت! فخر عالم کا گھر جیسے سرسبز پیالے کے پینڈے میں واقع تھا۔

"یہ والے درخت کس چیز کے ہیں۔" مسوری دھنک نے پائیز کے علاوہ بڑے بڑے

درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ اخروٹ کے ہیں مگر۔" وہ مسکرایا "تمہیں کچے ہوئے اخروٹ بمشکل نظر آتی ہیں۔"

"کیوں؟"

"پکنے سے پہلے ہی بند رکھا جاتے ہیں۔"

اور دھنک خوبصورتی سے ہنس دی۔

"تم سوچو گی میں اتنی سادگی سے اپنی برتھ ڈے مناتا ہوں۔"

"ہاں۔"

میں تو شاید مناتا ہی نہ مگر میرے بابا کہا کرتے تھے چاہے اکیلے کیک کا ٹوکر برتھ ڈے

ضرور مناؤ۔۔۔ "وہ جیسے یادوں میں کچھ پیچھے چلا گیا تھا۔

"بابا کی برتھ ڈے بھی میں ہی منایا کرتا تھا۔ انہیں کبھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کب انکی برتھ

ڈے ہے۔ امی تو میں چھوٹا سا تھا جب ڈیجھ ہو گئی تھی انکی۔ پھر بابا ہی میرے سب کچھ

تھیں کچھ عرصہ بعد انہوں نے دوسری شادی کی۔ مگر میری پرورش میں کوئی کسر اٹھانہ نہ تھی۔

READING

اسے کیا پریشانی تھی؟ دھنک سوچے بنا نہ رہ سکی۔

اس نے بھی مزید نہیں پوچھا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اسکا دھیان ہٹانے کو۔ اسے خوش کرنے کو۔

پھر اس نے اجازت چاہی۔

باہر شام کے دھند لکے اتر آئے تھے۔ ڈھلانوں پر ادھر ادھر بکھرے چھوٹے چھوٹے گھر وندوں میں روشنیاں جل اٹھی تھیں، جیسے بہت سارے سنہرے موتی گر کر بکھر گئے ہوں۔ سر بفلک پائینز میں ہوا کی مخصوص سنسنائٹ ہونے لگی تھی۔

”میں جاؤں اب۔ دیر ہو رہی ہے۔“ دھنک نے کہا۔

”نہیں پلیز! اتنی جلدی نہیں۔ مجھسا کیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔

”لیکن جانا تو ہے نا۔“ وہ مسکرا دی۔

”تھوڑی دیر اور۔“ اس نے دھیرے سے اسکا ہاتھ اٹھایا۔ ہولے سے اپنے ہونٹ اس

پر رکھ دیئے۔

اور پھر جیسے اچانک کچھ یاد آیا۔

دلنیشیں آنکھوں میں شوخ چمک لہرائی۔ پرکشش لبوں پر شریر مسکراہٹ۔

”تم مجھے Kiss نہیں دو گی۔ آج میری برتھ ڈے ہے۔“

اور جھمکتے جھمکتے دھنک نے اپنے یا تو تھی ہونٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

”اوں ہوں۔ یہاں نہیں۔“ اس نے اپنا گال قریب کر دیا۔ ”یہاں۔“

اور دھنک نے وہاں بھی ہولے سے اپنے لب رکھ دیئے۔

فخر عالم مدہوش سا ہو گیا۔ آہستہ سے اسے اپنے سینے سے لگایا اور دھیرے دھیرے ذمیر

سارا پیار کر لیا۔

”اب جاؤں۔“ اسکی گرفت سے نکلنے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

وہ شرمائی شرمائی سی تھی۔ ہلکیس او پر اٹھ نہ پار ہی تھیں۔

”Now help me.“ اس نے ایک کانٹے وقت کہا۔

اور دھنک اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

دونوں نے اکٹھے ایک کاٹا۔ فخر عالم نے پیس پہلے دھنک کے منہ میں دیا باقی کا خود کھالیا۔

پھر انٹرکوم پر ہیرے کو بلایا۔ ہیرا فوراً آ گیا۔

”یہ ایک تم لوگوں کیلئے ہے۔“ فخر عالم بولا۔

اور ہیرا سے Greet کرتے ہوئے ایک اٹھا کر چل دیا۔

وہ دونوں خوشگوار باتوں کے دوران مختلف چیزوں میں سے کھا رہے تھے۔

”چائے یا کوئی؟“ فخر عالم نے پوچھا۔

”کوئی۔“

”گڈ۔ کوئی تو ٹیسٹ ہم دونوں کا ملتا جلتا ہے۔“

وہ مسکرا دی۔ ہولے سے۔

”تمہاری سائٹل بہت Attractive ہے۔“ اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ

مزید بولا۔

اور دھنک پھر دھنک کے رنگوں میں رنگ گئی۔ وہ محفوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

پھر کوئی آگنی۔ فخر عالم نے دھنک کیلئے کوئی میں دودھ اور چینی ملائی اور اپنے لئے

حسب عادت کوئی میں صرف کھولتا ہوا پانی ملا دیا۔

دھنک حیرے لے لے کے پینے لگی۔ جبکہ فخر عالم کڑوے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

”حلق جل جائیگا۔“ دھنک مسکراتے ہوئے بولی۔

”حلق کا کیا ہے۔ میں تو سارے کا سارا جل رہا ہوں... کافی عرصے سے۔“ وہ اچانک

نجیدہ لگنے لگا۔

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔ کوئی اور بات کرو۔“

وہ مفلوکا ہوتے ہوئے دیر سے سے مسکرایا۔
 "چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"صرف دریا کنارے تک۔"

"کیوں؟"

"آگے کہیں امی ابول گئے تو شامت آجائگی۔"

"ٹھیک ہے آؤ۔" اس نے دھنک کا ہاتھ تھام لیا۔

دونوں باہر نکل آئے۔

ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اپنی دھن میں مست باتیں کرتے وہ چلے جا رہے

تھے۔

تجھی۔ ایک لمبی سی سفید گاڑی فخر عالم کے گھر کے میز سے راتے پر آتی انہیں

دیکھ کر رک گئی۔

فخر عالم نے آہستہ سے اسکا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"Just a minute." اس نے دھنک سے کہا۔

اور۔ گاڑی کی طرف بڑھا۔

یہ وہی لڑکی تھی۔ جسے ایک بار دھنک نے شہر میں فخر عالم کیساتھ گاڑی میں بیٹھے دیکھا

تھا۔ اور جسکی سوچ اکثر اسکے ذہن میں سر ابھارتی۔

اسکا دل بیٹھ سا گیا۔

فخر عالم قریب پہنچا تو وہ گاڑی سے اتر آئی۔ بے اختیار بازو فخر عالم کی گردن میں جمائیں

کریے۔ بے تماشائے چہرے پر پیار کرنے لگی۔

"Happy birth day my love." وہ قدرے دم لینے کو رکھی تو اسے

Greet کیا۔

تھینکس۔ "فخر عالم مختصر ابولا۔ تم اندر جاؤ۔ میں انہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔" اسکا اشارہ
 دھنک کی طرف تھا۔

"Who is she supposed to be?" وہ بڑی حقارت سے پوچھنے

لگی۔

"میرے بابا کے دوست کی بیٹی ہے۔" فخر عالم نے بات بنائی۔

"اچھا ڈارنگ جلدی آتا"

وہ گاڑی میں اندر کی طرف گئی۔ اور فخر عالم دھنک کی طرف۔

دھنک نے کوئی سوال نہ کیا۔ کہ سوال کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ نہ ہی فخر عالم کچھ

بولتا۔ کہ اسکے پاس بھی صفائی دینے کو کچھ بچا نہیں تھا۔

دریا پار کر نوالی جگہ پر پہنچے تو وہ کچھ بھی بولے بنا آگے بڑھ گئی۔

"خدا حافظ بھی نہیں کہو گی۔" وہ اداس سا بولا۔ کہ اسے یقین تھا دھنک کا اس پر سے

اعتماد اٹھ چکا تھا۔

"نہیں۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

اور۔ پتھروں پر پاؤں رکھتی دریا پار کرنے لگی۔

اس پار پہنچی تو نہ چاہتے ہوئے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

فخر عالم اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے پا کر ہاتھ سے دیو کیا اور تھکے تھکے قدموں سے

اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

یہ کیا معرہ تھا؟

پہلو میں ایک لڑکی اور شاید دل میں دوسری۔ پر نہیں۔ دھنک نے جلدی ہی اپنے خیال کی۔ تردید کی وہ فخر عالم کے دل میں نہ کبھی تھی نہ ہے اور نہ رہے گی۔

وہ ایک امیر گھرانے کا فلرٹ آدمی تھا اور بس!

چائے سے فارغ ہو کر وہ لوگ پھر سے گھومنے نکلے۔ راستے میں پھر وہ دونوں مخالف سمت سے آتے مل گئے۔

فخر عالم اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں پیار تھا، اپنائیت تھی۔

مگر۔ دھنک سیدھی نکل گئی۔ کہ وہ اسکی منزل نہیں تھا۔ وہ اس کا مقدر نہیں تھا!

بھلا دریا کے دو کنارے بھی کبھی مل پائے تھے؟

اسکی زرین خوبصورت آنکھوں میں دو تارے سے ابھرے۔ اس نے جلدی سے آنکھیں

جھپک لیں۔ مبادا کوئی دیکھ لے!

اسکی چھٹی بھی کل ختم ہو نیوالی تھی۔ پرسوں واپس ڈیوٹی پر جانا تھا۔ اچھا تھا چلی جاتی۔

اس تپتی آگ کی لپٹوں سے تو نکل پاتی۔

چلتے چلتے اسکے پاؤں پر ایک پتھر آگرا، اتنا بڑا بھی نہیں تھا۔ چوٹ تو لگی مگر اتنی بھی نہیں

کہ وہ۔

وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پھر۔ روتی چلی گئی۔ کہ دل پر بہت بوجھ تھا۔ ہلکا کرنے لگی اسے۔

سلیم اور نیلم حیران تھیں کہ دھنک تو بہت صابر بہت مضبوط ہوا کرتی تھی۔

مگر پہنچ کر کھانے کے بعد باقی کا سارا وقت وہ بہنوں کیساتھ ٹی وی دیکھتی رہی۔ جبکہ

اس سے قبل وہ باوجود بہنوں کے اصرار کے سیدھی جا کر بستر میں گھس جاتی۔ کہ جب

آنکھیں بند کرتی تو فخر عالم آن پکتا!

اور آج۔ ایسی کوئی ضرورت نہ رہی تھی۔

اپنے آپ کو معروف رکھنے کو وہ اب ہر وقت تسلیم اور نیلم کیساتھ رہنے لگی۔ وہ جہاں جاتیں نہ چاہتے ہوئے بھی ساتھ چل پڑتی۔

ہر شام ابو امی نیلم اور تسلیم کیساتھ باقاعدگی سے نیچے پارک میں جاتی۔ جہاں بیسیوں

ٹورس گھومتے پھرتے نظر آتے۔ وہ لوگ بھی گھومتے پھرتے کبھی تھک کر بیٹھ جاتے۔ کبھی چند

ہی دکانوں پر مشتمل بازار میں نکل جاتے۔ سوسے، پکوڑے اور چائے جو یہاں کی سوشلسٹی تھی،

لکڑی کے میلے کیلے بچوں اور میز پر بیٹھ کر کھاتے۔

مگر۔ دل تھا دھنک کا کہ چور چور ہو گیا تھا۔ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

سب کیساتھ مل بیٹھتے ہوئے بھی جیسے اپنے کو تنہا محسوس کرتی، بات بات پر چونک اٹھتی۔

آج شام وہ نیلم اور تسلیم کیساتھ چائے کی دکان پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ حسب عادت

نیلم اور تسلیم چپک رہی تھیں۔ جبکہ وہ پیالی ہاتھ میں پکڑے خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

تجھی۔ اسکی نظروں میں دو ہیو لے ابھرے۔ پھر دونوں ہیولوں نے فخر عالم اور اس

لڑکی کا روپ دھار لیا۔

لڑکی فخر عالم کے بازو میں بازو ڈالے بازار میں سے گزر رہی تھی۔ شوخ رنگ کے کپڑے

اور تیز رنگوں کے میک اپ میں وہ پورے بازار کی نظروں کا تماشائی فخر عالم کیساتھ چلی جا رہی تھی۔

تو اب تک وہ یہیں تھی!

اچانک فخر عالم کی نظریں چائے کی دکان میں دھنک پر پڑیں۔ فخر عالم کی نشلی آنکھوں

میں جیسے دپ سے جل اٹھے۔ پرکشش ہونٹوں پر مبہمی مسکراہٹ ابھرا آئی۔ اور۔ اسے

دیکھتے دیکھتے وہ وہاں سے گزر گیا۔

بارش تیز سے تیز تر ہونے لگی۔ گھر خاصا دور تھا۔ وہ چند قدم پر ٹوٹے پھوٹے کھنڈر نما مکان میں گھس گئی۔ کم از کم ٹین کی چھت تلے وہ چند گھڑی پناہ تو لے سکتی تھی۔

اندر ٹین کی چھت کی جلت رنگ اور باہر غضب کی بارش اور ہوا کا طوفان! اسے تو یہ بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔

مگر۔۔۔ بارش اور طوفان نے طول پکڑ لی۔ جل تھل ہونے لگا۔ بارش کی جیسے آسمان سے لیکرز میں تک چادری تن گئی اور۔۔۔ وقت سے کہیں پہلے اندھیرا چھا گیا۔ اب وہ کچھ پریشان سی نظر آنے لگی۔

سامنے ڈھلانوں اور چوٹیوں پر کے مکانوں کی بتیاں جل اٹھی تھیں۔ اچانک جیسے ان گنت تارے آسمان سے ٹوٹ کر پہاڑ پر یہاں وہاں بکھر گئے تھے۔ اس گھپ اندھیرے میں ٹھنڈی بتیاں۔ طوفان باد و باراں اور یہ ٹوٹا پھوٹا کھنڈر! پراسرار سا لگ رہا تھا سب۔

اس پر کسی کے بھاری قدموں کی چھاپ!

وہ دم سادھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے بارش کی پہلی بوند کیسا تھہری گھر کی طرف چل پڑنا چاہیے تھا۔ اس طرف کم از کم آبادی تو تھی۔ کسی کے مکان میں بھی گھڑی دو گھڑی کو پناہ لے سکتی تھی۔ وہ پچھتاتی۔

اور۔۔۔ لمحوں میں ہی رین کوٹ پہننے بارش میں سر سے پاؤں تک بھیگا۔ فخر عالم اسکے سامنے تھا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود وہ اسے پہچان گئی۔

”اوہ۔۔۔ تم بھی یہاں ہو۔۔۔ گڈ ایوننگ نسیم۔“ فخر عالم نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ان ایڑی سا محسوس کرنے لگی۔

دونوں بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے وہ ٹوٹے دروازے کے چوکھٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ نظریں باہر کے طوفان پر جمادیں۔

”تمہیں یہاں اکیسے نہیں آنا چاہیے تھا۔“ اسی طرح باہر دیکھتے ہوئے وہ پھر بولا۔

دھنک نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

کل اس نے واپس جانا تھا۔ آج دن کو سب گھر والے کھانا ساتھ لے کر دو تین میل دور پک تک منانے گئے۔ سہ پہر کو گھر آئے تو وہ تھکی تھکائی اپنے بستر میں گھس گئی۔ سو کر اٹھی تو طبیعت کچھ بحال تھی۔

وہ ہاتھ روم گئی۔ منہ ہاتھ دھوئے۔ مونگیا گرم کپڑوں پر گرے رنگ کا خوبصورت سویٹر پہنا۔ کپڑوں کے ہمرنگ دوپٹے لے کر جو گزر پہننے، کپڑوں پر پرفیوم کی سپرے کی۔ اور باہر برآمدے میں نکل آئی۔

گھر خالی پا کر اسے ہنسی آگئی۔ اگر وہ کبھی سو رہی ہوتی تو ان لوگوں نے کبھی اس کا انتظار نہیں کیا۔ بس چل پڑے جدھر منہ کیا۔

وہ بھی باہر آگئی۔ چلتی چلی گئی۔ بازار سے بھی آگے نکل گئی۔ یہاں وہ اکثر رک جایا کرتی تھی۔ دائیں طرف بہت بڑی کھائی تھی۔ جو خاص طور سے اس وقت کبھر سے اٹی پڑی ہوتی تھی۔ کچھ بھی تو نظر نہ آتا تھا۔ سوائے سفید سفید دھند کے۔

دور اس پار البتہ پانچویں چھٹی چوٹی پر لمبی قطار میں درخت ڈوبتے سورج کی سرخی چرائے کھڑے رہتے تھے، اتنے سیدھے اور اتنے برابر فاصلے پر۔ جیسے یونیفارم پہنے فوج کے جوان کسی مہم پر جانے کو تیار کھڑے ہوں۔

معا موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔

وہ تو چھتری بھی بھول آئی تھی۔ نہ ہی رین کوٹ کی ضرورت محسوس کی تھی۔ یہاں یہی تو اکثر دھوکہ ہو جاتا تھا۔ سنہری چمکتی دھوپ میں گھر سے نکلنا اور بل بھر میں اچھی طرح بھیگ کر واپس گھر پہنچنے۔

"بولو گی نہیں۔ ہاں۔" اس نے رخ دھنک کی طرف کر لیا۔

وہ چپ تھی۔

"ہات کرونا۔"

"نہیں۔" اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"خفا ہو؟"

اس نے پھر سر انکار میں ہلایا۔

فخر عالم دھیرے سے ہنس دیا۔ پھر سے باہر دیکھنے لگا۔

آسمان گرج رہا تھا، بجلی چمک رہی تھی، طوفان بڑھ رہا تھا۔

سردی بے تحاشہ اتر آئی تھی۔ دھنک کے کپڑے ناکافی ہو رہے تھے۔

خاصی بولڈ ہونے کے باوجود پتہ نہیں کیوں اسے آسمانی طوفان اور زلزلے سے بہت

خوف آتا تھا۔ اس وقت بھی بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک سے کبھی جا رہی تھی۔

اب تو پانی اندر بھی آنے لگا تھا۔ تیز ہوا بدن کو چیرتی گزرنے لگی تھی۔ سردی حد پھانڈنے

لگی تھی۔

"ادھر آ جاؤ۔" فخر عالم نے اسے کہا۔

کہ اسکی جگہ پھر بھی کچھ گزارا تھی۔

"نہیں۔"

وہ اسکی ضد پر دھیرے سے مسکرا دیا۔

"دیکھو گیلی ہو رہی ہو بیمار ہو جاؤ گی۔"

"آچکھو کیا بیمار بھی ہو گئی تو۔" جانے کیسے وہ بول پڑی۔

وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

"میں بھی بیمار ہو جاؤ گا۔"

وہ طنزیہی مسکرا دی۔

پانی کا تیز ریلہ آیا اور اسے سارا بھگو گیا۔

دھنک نے فخر عالم کی طرف دیکھا۔ مگر اب کے وہ بھی خاموش رہا۔ وہ خواہ مخواہ

ضد کئے جا رہی تھی تو وہ کیا کر سکتا تھا۔

اچانک آسمان زور سے گرجا۔

فخر عالم نہ ہوتا تو دھنک کی چٹخیں نکل جاتیں۔

وہ اپنی جگہ سے قدرے ہٹ آئی۔

فخر عالم اسے دیکھ دیکھ کر دلنشین انداز میں مسکرا رہا تھا۔

دھنک کو اچھا نہ لگا۔ خوبصورت ماتھے پر ٹٹنیں ابھرا آئیں۔

باہر اچانک گھپ اندھیرا ہو گیا۔ ایسے موسم میں بجلی بھی فوراً نکل ہو جاتی تھی۔ تمام قصبہ

تاریکی میں ڈوب گیا۔

معاذ دوسرے بجلی تڑپتی۔ تمام علاقے کو پل بھر کو روشن کر گئی۔

اسکا دل باقاعدہ دھک دھک کرنے لگا۔ کچھ اور کھسک کر فخر عالم کی طرف ہو گئی۔

وہ اندھیرے میں اسکی گھبراہٹ سے محفوظ ہوتا مدھرا انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اچھا لگ

رہا تھا اسے یہ سب۔

"یہاں ان دنوں چیتے بھی نکل آتے ہیں۔" وہ دھیرے سے بولا۔

اور دھنک اسکے بالکل ہی قریب چلی آئی۔ خوف سے پھیلی آنکھیں لئے وہ اندھیرے

میں فخر عالم کو دیکھ رہی تھی۔

اچانک پاس سے ہی کسی جانور کی آواز آئی۔

اور۔۔۔ دھنک نے بے اختیار فخر عالم کا بازو پکڑ لیا۔

"گیڈر ہے شیر نہیں۔" وہ اطمینان سے بولا۔

اور جھل سی دھنک نے۔ اپنا ہاتھ اسکے بازو سے ہٹا لیا۔

فخر عالم بمشکل ہنسی روکے اسے دیکھ رہا تھا۔

بارش کب تھی؟ آسمان کب خاموش ہوا؟ طوفان کب رکا؟

انہیں کوئی ہوش نہیں تھا۔ خبر تھی تو بس اتنی کہ دھنک فخر عالم کے بازوؤں میں تھی۔ دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے اور گرم گرم سانسیں ایک دوسرے میں غم ہو رہی تھیں۔
 ”آؤ تمہیں چھوڑ آؤں۔ تمہارے گھر والے پریشان ہو رہے ہونگے۔“ فخر عالم ہوش میں آئی گیا۔

”چلیں۔“

اور فخر عالم کے نورج کی روشنی میں وہ ہنسا قدم اٹھاتے اونچے نیچے پتھروں بڑھلانوں پر چڑھتے اترتے۔ دھنک کے فلیٹ کی طرف جانے لگے۔

”اوکے۔ گڈ نائٹ۔ سی یو۔“ وہ اسکے گھر سے چند قدم دور ہی رک گیا۔
 ”گڈ نائٹ۔“ وہ بھی دھیرے سے بولی اور۔

آگے بڑھ گئی۔

اسے یہ فکر نہیں تھی کہ گھر میں پوچھ گچھ ہوگی۔ کیونکہ یہاں کا موسم ہی ایسا تھا۔ گاؤں بھی بالکل چھوٹا سا تھا۔ بارش میں کوئی کہیں رک کر اسکے ختم ہونے کا انتظار کر سکتا تھا۔ کسی کے گم ہو جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ سوچتی ہوئی وہ گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

یکدم ہی ایک بار پھر بجلی تڑپی۔

فخر عالم نے دیکھا دھنک اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ پھیلی پھیلی خوبصورت آنکھیں لے۔

ان نظروں میں کچھ تھا۔ آس! Longing!

وہ سرشار ہو گیا۔ اپنا ہاتھ اسکی طرف بڑھایا۔ اسے اپنے قریب لے آیا۔

اور۔۔۔ گڑ گڑاہٹ سے جیسے زمین و آسمان لرز اٹھے۔

فخر عالم نے سہی سہی دھنک کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ بے تحاشہ پیار کرنے لگا۔

”اب بھی کہو میں تمہیں پیار نہیں کرتا۔ اب بھی کہو فلرٹ کر رہا ہوں، اب بھی کہو میں

اچھا آدمی نہیں...“

وہ خاموش رہی۔ اسکے بازوؤں کے حصار میں خود کو محفوظ سمجھتی اسے سکتی رہی۔

”تمہاری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی سمجھتا۔ کہ فلرٹ ہوں، اچھا آدمی نہیں۔ اگر تمہیں

پیار کرتا تو تمہیں حاصل کرنے کی سوچتا۔ پر میری جان میری کچھ مجبوریاں ہیں۔“ اس نے

گہری سانس لی۔ ”تمہیں بتا کر میں پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں چاہتا ہوں بے اندازہ،

بے پناہ۔ تمہارے علاوہ تو میں کسی کا سوچ بھی نہیں سکتا مگر۔۔۔ کچھ وقت لگے گا۔ تم امید ہے

میرا ساتھ دوگی۔ میرا انتظار کروگی۔“ اسے پیار کرتے کرتے وہ کہتا گیا۔ اسکے لہجے میں بے

بسی سی تھی، پریشانی سی تھی۔

اسکی بے بسی پریشانی دھنک کو اپنی روح میں اترتی محسوس ہوئی۔

جانے کیوں اسے اسکی باتوں میں سچائی کی مہک محسوس ہوئی۔

دوہوتی لڑھک کر اسکے گال بھگو گئے۔

”میرا گھر، میرا ایڈریس، ٹیلیفون نمبر سب تمہیں پتہ ہیں۔ ہم آپس میں ملتے رہیں گے۔

کب تک؟ یہ میں خود بھی نہیں کہہ سکتا۔ مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم سے

مبت ہے۔ فلرٹ نہیں کر رہا۔ حقیقت ہے یہ...“ اسکی بھگی بھگی آنکھوں پر پیار کرتے

ہوئے وہ دھیرے دھیرے کہتا گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

آصف اور دھنک کے درمیان ہفتے میں دو ایک بار ضرور یہ تکرار چلتی۔ آصف کو دھنک اس مطلب سے اچھی لگتی تھی یا نہیں پر کہنا ضرور تھا۔

”وہ جو آٹھی بار بار تکرار کر رہی ہیں انہیں انکار لکھ دو“ آصف نے کہا۔

”اچھا۔ بلکہ میں تو پہلے ہی ایک دفعہ انکار لکھ چکی ہوں۔“

”یہ ہوئی نا بات۔“

”بالکل نہیں ہوئی۔ یہ بتاؤ صبح سے کہاں غائب تھے۔ پتہ ہے کچھ بارہنہ رہے ہیں۔“

دھنک اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”کوئی ضروری کام تھا۔ کسی نے پوچھا تو نہیں تھا؟“

”پوچھا تھا۔ میں نے بہانہ بنا دیا۔ آج مجھے بھی جلدی ہے۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔ گھر جاؤنگی ڈرائیو لینگلی۔“

”تموڑی دیر ٹھہرو۔ پھر اسٹے چلتے ہیں۔“

”اچھا۔“

اور آصف کمرے سے نکل گیا۔

پھر ٹھیک ایک بجے آیا۔

”آؤ چلیں۔“

دونوں باہر آگئے۔ آصف کی موٹر بائیک پر دھنک بھی اسکے پیچھے بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا تھا۔ کبھی پریس سے متعلق کسی کام سے، کبھی دونوں کو اسٹے کوئی اسائیٹمنٹ ملی ہوتی۔ اور کبھی اسے بس نہ ملتی تو وہ آصف کیساتھ ہی فلیٹ آجاتی تھی۔

دونوں چل پڑے۔ کچھ ہی دور گئے تھے۔ دھنک نے دیکھا۔

فخر عالم تھا۔ آج اپنی گاڑی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ انکے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

دھنک کی ہیزل آنکھوں میں قدر بلیں سی جل اٹھیں۔ خوبصورت ہونٹ مسکرا دیئے۔ نازک سے ہاتھ سے اسے دبوکیا۔

دن بیت رہے تھے۔ بے کیف سے۔ وہ روزانہ رسالے کے دفتر جاتی۔ کان منتظر رہتے

کہ شاید فخر عالم کی کوئی خبر ملے۔ پھر سوچتی ابھی تو صرف چند دن ہی ہوئے ہیں اسے واہس

لوئے۔ ابھی شاید فخر عالم اور بھی رہے گا وہاں۔

یہ کبھی دھنک نے اسکا پروگرام پوچھا تھا۔ نہ ہی اس نے کوئی خاص بتایا تھا۔ کہ کب

لوٹ رہا تھا۔ شاید برف پڑنے تک اس نے وہیں رہنا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دیتی۔

پھر اچانک خوبصورت چہرے پر سائے سے چھا جاتے۔ کیا وہ لڑکی ابھی تک ادھر تھی؟

اور کیا فخر عالم کے نہ آنے کی وجہ وہ لڑکی ہی تھی؟

کون تھی وہ لڑکی؟ کیا تھی تھی فخر عالم کی؟

وہ تو فخر عالم کو اس قدر شدت سے چاہنے لگی تھی کہ واپس لوٹنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

ورنہ شاید کوئی اور اسکی جگہ ہوتی تو کبھی کی مایوس ہو کر فخر عالم کا خیال چھوڑ چکی ہوتی۔ اسکی

Will power کہاں گئی۔

دو لڑکیوں میں بے آدمی کا کیا بھروسہ؟

”اے لڑکی۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔“ آصف تھا، اسکا کوئی لگ۔ آتے ہی بیک ڈیسک پر

رکتے ہوئے بولا۔

وہ خیالوں سے چونکی۔ مسکرا دی۔

”اے لڑکے۔ تم بھی مجھا جھٹکتے ہو۔“ اس نے بھی اسی کے لہجے میں کہا۔

”شادی تم نے میرے ساتھ کرنی ہے۔“

”بس یہی مشکل ہے۔“

وہ کا جواب اس نے بھی دیا۔ نخریں بھی دھنک پر تھی جس مگر۔
جیسے جس سے تھا اور بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ جیسے تھا بھی تھا مگر چہا ہوا تھا۔
کیوں؟ شاید اسلئے کہ وہ آصف کیساتھ بیٹھی تھی؟
اچھا ہاں۔ اسے بھی پتہ چلے یہ آگ کیا ہوتی ہے؟
آصف اسکے ظہن کی طرف مڑنے لگا تو نظر عالم نے تیزی سے گاڑی سے اٹھ کر نکال لی۔

آج پھر وہ چھٹی کے وقت سٹریٹ کے قریب ہی بس سٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔
تجھی ایک بار پھر نظر عالم کی کار اسکے پاس آ کر کی۔ آج بھی وہ اکیلا ڈرائیو کر رہا تھا۔
"آؤ۔" سبجز سیٹ کا دروازہ اس کیلئے کھولتے ہوئے وہ بلا تہیہ بولا۔
وہ کچھ جھجکی رہی تھی۔ جانے دھڑوا لے دیکھ کر کیا سمجھیں؟ مظلوم پڑھنے میں سیکھ ل
بننے کوئی دیر تو تھوڑی لگتی تھی۔
"آؤ۔" وہ ایک بار پھر بولا۔ اس کے لہجے میں حکم کیساتھ پتکاری بھی تھی۔
وہ بیٹھ گئی۔ گاڑی چل پڑی۔
"آفس والے باتیں نہ بتائیں اسلئے... " وہ آہستہ سے کہنے لگی۔
"کل مونڈ بائیک پر اس لڑکے کیساتھ چپکلی چلی جا رہی تھی۔ جب باتوں کا ڈرنیس تھا۔"
اسکے لہجے میں دھمازی تھی۔
نڈری دھنک بھی سم گئی۔
"وہ تو... وہ تو میرا کوئی لگ ہے۔"
"کوئی لگ کیا مر نہیں ہوتا۔"
وہ چپ رہی۔ سامنے دیکھنے لگی۔
"آئندہ اگر میں نے تمہیں اس لڑکے کیساتھ دیکھا تو اچھا نہیں ہوگا۔" وہ اب بھی فصر
میں تھا۔

دھنک کو اچھا نہیں لگا۔ اتنا رعب ڈالے جا رہا تھا۔
"آپ مجھے بلاوجہ ڈانٹ رہے ہیں۔"

"بلاؤ؟" چند منوں کو اس نے گازی کی رفتار ہم کر لی۔ رخ اسکی طرف کیا۔

آہ سے اسے اپنے پہلو سے لگا لیا۔

"اتنا صبر گزر گیا۔ کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں کہ میں تم سے بچا کرتا ہوں۔ اور ایک مرد اپنی محبت کو کسی اور کیساتھ نہیں دیکھ سکتا۔"

"یہی حال ایک لڑکی کا بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنے بچا میں کسی کو شریک نہیں دیکھ سکتی۔"

دھنک نے بڑی ہوشیاری سے اس لڑکی کا Hint دیا۔

ایک ہل کو وہ گزرا سا گیا۔ پھر سنبھلنے کی کوشش کی۔

"تمہارے بچا میں کوئی شریک نہیں ہے۔" وہ بڑے ہنوق سے بولا۔

"پھر وہ بھی میرا سیدھا سادا اکو لیک ہے۔"

"جیسا بھی ہے۔" ہے تو غیر مرد۔ دیکھنے والے ہاتھ بنا سکتے ہیں۔" فر عالم نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"اور... آپ کیساتھ کیا خیال ہے گھومتے ہوئے ہاتھ نہیں بن سکتیں۔"

وہ ہنس دیا۔ خوشگوار سے

"میری بات اور ہے۔"

"کیا ہے؟"

"یہ ہے۔" اس نے ہولے سے اسکا نازک سا ہاتھ دبا لیا۔ "ویسے تمہیں پتہ ہے میں پر میں والوں سے الگ ہوں۔ پتہ نہیں کیسے یہ دونوں میں اس طرف آ گیا۔ آئندہ میں تمہارے فلیٹ پر آیا کروں گا۔"

"میرے ساتھ فلیٹ میں ایک ٹیچر بھی رہتی ہے۔" دھنک نے مطلع کرنا مناسب سمجھا۔

"ٹیچر؟ پھر کہاں ملیں گے ہم لوگ۔" وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

"میں گے ہی نہیں کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"میں مرجاؤں گا۔" وہ ہنس دیا۔

"میں بھی مرجاؤں گی۔" وہ بھی ہنس دی۔

"اچھا سیر۔ سلی۔ کوئی حل ڈھونڈتے ہیں... میں فلیٹس کے احاطے سے باہر بہن کروا کر دیکھتا ہوں۔ تم سمجھ لیتا اور آ جاتا۔ پھر گھر سے فلیٹس کے اوپر ادھر..."

"آپکا اور کوئی کام نہیں ہے۔" اس نے اسے ہچکڑا۔

"ہوں ہوں۔" اس نے خوبصورتی سے سرنگی میں ہلا دیا۔

جبکہ۔ اس کی اتنی مصروفیات تھیں کہ وہ خود حیران ہوتا تھا کہ کیسے وہ دھنک کیلئے وقت نکال پاتا تھا۔

"تم مجھے فون کیوں نہیں کرتی ہو۔"

"کیا تھا۔"

"کب؟"

"کچھ دن پہلے، مگر کوئی افہام نہیں رہا تھا۔"

"ظاہر ہے وہ میرا پرائیویٹ نمبر ہے اور میں صرف پر سوں آیا ہوں۔ اب کرنا۔"

"اچھا۔ مگر زیادہ بات نہیں ہو سکے گی۔"

"کیوں؟"

"آفس کا فون ہو گا نا۔"

"اوہ۔ تمہارے فلیٹ میں فون نہیں۔"

"نہیں۔"

"بہہ۔" اس نے جھنجھلا کر سنیرنگ پر ہاتھ مارا۔ "بس سیدھی سی بات ہے۔ میں تمہارے فلیٹ پر آ کر سب کے سامنے تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں کوئی کیا کرتا ہے... وہ جھنجھلایا جھنجھلایا بول رہا تھا۔

اور دھنک دیر دیر سے مسکرائی تھی۔

کچھ دیر دونوں طرف خاموشی رہی۔

"اب کس طرف نم ۲"
 "لٹ۔ اور تیرا گیت ہمارے فٹنس کا ہے۔"
 "ہوں۔" اور سینکڑوں میں وہ گیت کے پاس تھا۔
 "اچھا۔ خدا حافظ۔" دھنک گازی سے نکتے ہوئے بولی۔
 "خدا حافظ۔" فخر عالم نے ہاتھ ہلایا۔
 اور۔۔۔ واپس اپنی راہ پر چل دیا۔

آجکل وہ دو جزوں میں بنی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک نوجوان لڑکا تھا جس کی دیکھ بھال کسی دیکھ بھال سے محروم تھی۔ اور دوسری طرف ایک نوجوان لڑکی تھی جس کی دیکھ بھال کسی دیکھ بھال سے محروم تھی۔
 زبردست یکساہت تھی دونوں بہنوں میں۔ شکیں ایک جیسی، ماؤں ایک جیسی بہنوں کا انداز ایک سا، ہنسی، سنجیدگی سب۔ وہ بار بار دھوکہ کھا جاتی۔۔۔ بڑا دلچسپ نمبر تیار ہو رہا تھا میگزین کیلئے!

گرمی کا زور ختم ہو چلا تھا۔ دن چھوٹے راتیں طویل پکڑ رہی تھیں۔ پرسوں سے بادل آ جا رہے تھے۔ بس دو ایک بارشوں کی دیر تھی اور پھر۔۔۔ سردی!

سردی کا موسم اسے بے حد اچھا لگتا تھا۔ سردی کی آمد اپنے ساتھ انوکھی خوشی کا پیغام لاتی تھی۔ اور اس دفعہ تو فخر عالم بھی انکی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ زندگی اچانک کتنی حسین ہو گئی تھی۔

اس وقت پھر وہ ان دو بہنوں کی طرف رواں دواں تھی۔ آج آخری نشست تھی اور پھر فیچر مکمل ہو جاتا تھا۔ کندھے سے بیگ لٹکانے تیز تیز قدم اٹھاتی وہ فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ زیر اسگ پار کرنے لگی تو نظر بائیں طرف کی ایک کار پر جا پڑی، فخر عالم تھا۔ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور۔۔۔ اور۔۔۔ وہی لڑکی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی۔ شاید اسے کہیں لے جا رہی تھی۔

وہ کسی طرح کراسنگ پار کر رہی تھی۔ گودل تھا کہ کڑچیاں ہو گئی تھیں انکی ہریزہ ہریزہ ہو گیا تھا۔

اور۔۔۔ اسے اچانک احساس ہوا فخر عالم میں اور اس میں اتنا ہی فرق تھا جتنا فٹ پاتھ

READING
Section

پر چلے والوں اور کاروں میں چلنے والوں میں ہوتا ہے۔

وہ اوہری آج ہی اس بات کو ختم کیوں نہیں کر دیتا؟

وہ ہانتی تھی فخر عالم اسکے دل میں دھڑکن بن کر دھڑک رہا تھا، روح بین کر جسم میں سوجھا تھا۔ گروہ اپنی توہین بھی تو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ حالات ایسے ہو گئے تو وہ سوشل مالوں کو اپنی عزت پر قربان کر سکتی تھی۔ اور۔۔

اس نے تہیہ کر لیا۔ وہ اس سے قطع تعلق کر لے گی!

جیکے ساتھ میں وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ ایسا کرنے میں وہ نوٹ پھوٹ جائیگی، بکھر جائیگی۔

ان لڑکیوں کے اندر وہ سے فارغ ہو کر وہ سیدھی اپنے قلب پر گئی۔ کچھ دیکھ تو یوں ہی بے سدھی بستر پر اونٹنی پڑی رہی۔ ذہن جیسے ماؤف ہو گیا تھا اور کسی بھی جسم کی سوچ، غور و خوض کے قابل نہ رہا تھا۔

پھر جانے کس وقت فرزانہ آگئی۔ دھنک نے سر اٹھا کر دیوار پر لگے کلاک پر نظر ڈالی۔

”کیا بات ہے دھنک۔“ وہ پاس بیٹھ کر پیار سے اسکے بالوں میں ہاتھ بھیرتے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔“ اور اسکی گود میں سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کب تک یہ لاوا اسکے ذہن و دل میں پکڑا رہتا۔ کبھی تو باہر نکلتا ہی تھا اس نے۔

”میں دیکھ رہی ہوں کافی دنوں سے تم میں بہت چیخ آ گیا ہے۔ کبھی بہت خوش دکھائی

دیتی ہو۔ کبھی کچھ سوچتی ہوئی کم کم۔ مجھے بتاؤ شاید تمہارے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔“ وہ پھر رو دی

سکے آنسو اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھے ہوئے بولی۔

”ہاں فرزانہ کبھی میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ اور کبھی کم کم۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔“ وہ پھر رو دی۔

”بتاؤ گی نہیں کیا بات ہے؟“

”یہ تو مشکل ہے میں بتا نہیں سکتی۔“ وہ روتے روتے بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے مت بتاؤ۔ مضمون دھولو۔ کیا حال کر لیا ہے اپنا۔ کھانا کھاتے ہیں مگر چلتے ہیں۔ بڑی اچھی سوڈی لگی ہے دیکھیں گے۔ آج آخری دن ہے اسکا۔“

”میں سوڈی نہیں دیکھوں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میرا دل نہیں کرتا۔“

”چلو شہناش تم منہ دھولو اور آؤ میز پر۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔“

وہ منہ ہاتھ دھو کر میز پر آگئی۔ فرزانہ نے کھانا گرم کر کے اسکے سامنے لگایا۔ خود بھی بیٹھ گئی۔

”دیکھو دھنک۔ تم مجھ سے پھوٹی ہو۔ میرا فرض ہے تمہیں سمجھانا۔ جس رات پر تم چل نکل

ہو۔ پھوٹک پھوٹک کر قدم اٹھانا۔ یہ راستے بڑے دشوار ہوتے ہیں۔ اور میں کبھی نہیں

چاہوں گی کہ تمہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔“

دھنک نے چونک کر اسے دیکھا۔ کیا وہ سب جانتی تھی؟

”مجھے کچھ معلوم نہیں وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ بہت احتیاط سے

کام لیتا۔ جذبات سے زیادہ عقل سے کام لیتا۔“ وہ کھانا شروع کرتے ہوئے پھر بولی

دھنک کچھ نہیں بولی۔ ہاں دل ہی دل میں فرزانہ کی ممنون ہوئی۔ ایک خیر خواہ اس سے

زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے؟

شام کو فرزانہ اس سے نرم دہتی سوڈی دکھانے لے گئی۔

کافی رش تھی۔ آخری دن جو تھا قلم کا۔ وہ دنوں بھی ٹکٹ لے کر گیلری میں جا بیٹھیں۔

قلم شروع ہوئی واقعی اچھی تھی۔ دنوں دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔ بڑیک ہوئی تو محبت

نوئی۔

بال میں جیاں۔ حل اٹھیں۔ وہ دنوں تھا طہ ہو کر بیٹھ گئیں۔

محالے سے پیچھے بوسے سے فخر عالم کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ چونک کر وہ مڑی۔ دکھا۔

وہی لڑکی فخر عالم کے کندھے سے سر نکالتے بیٹھی تھی۔ اور فخر عالم اس سے باتوں میں

مصروف تھا۔

اجنبیت لئے تھا۔

”تم یوں نہیں مانو گی۔“ وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔

اس پاس کی پرواہ کئے بغیر اسے بازو سے پکڑ کر کھینچے ہوئے ہینرز سیٹ تک لایا۔
بنا یا بدروزہ بند کرتے ہوئے اپنی سیٹ پر آیا۔ گاڑی سٹارٹ کی اور آگے بڑھنے لگا۔

”اب بتاؤ کیا ہوا ہے تمہیں؟“ نظر عالم نے ابتدا کی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

”تو پھر یہ حالت کیوں ایسی بنا رکھی ہے۔ بات کیوں نہیں کر رہی ہو۔“

”میری مرضی میں جس طرح بھی رہوں۔“

”آخر کچھ تو پتہ چلے۔“ وہ جھنجھلایا ہوا سنا تھا۔

”کچھ بھی نہیں ہے۔“

”بتاؤ ورنہ...“ وہ تیز ہو رہا تھا۔

”کیا کر لیں گے۔“ وہ بڑے تحمل سے بولی۔

اس نے گہری سانس لی۔ جیسے طعنے ضبط کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”اس لڑکی کی وجہ سے خفا ہو۔“

”مجھے کیا آپ جس کیساتھ بھی بھریں۔“

”تمہیں کوئی پرواہ نہیں میں جو بھی کروں؟“ گاڑی ایک طرف روک کر اس نے رخ

اسکی طرف کر لیا۔

”بالکل نہیں۔“

”اسکا مطلب ہے میں تمہارا کچھ بھی نہیں۔“

”ہاں۔“ کچھ بھی نہیں ہیں۔“

”کچھ بھی نہیں ہوں۔“ ساتھ ہی جانے کیسے اس کا ذہن ہاتھ اسکے پھول سے گال پر جا پڑا۔

”کچھ بھی نہیں ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہیں۔“ وہ گال پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

نظر عالم کی نظر بھی دھنک پر گئی۔ وہ کچھ چہرہ سا نظر آنے لگا۔

پور۔ دھنک رخ واپس موز کر اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

ظلم میں آگے کیا ہوا؟ کب ختم ہوئی؟ اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ فرزانہ ہی اسے ہاتھ سے

تھام کر لوگوں کی بھیل میں سے باہر نکال لائی۔

قلبت پر پہنچی کر وہ پھر بستر میں پڑی۔ ایک بار پھر بلک بلک کر رو دی۔

ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ نیچے سے جانا پہچانا سا ہارن ابھرا۔

یہ نظر عام کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مگر وہ ہرگز نیچے نہیں جاسکی اس نے سوچا۔ اور اسی طرح

اوپر بھی بستر پر پڑی۔ اب بھی ڈھیر سارے آنسوؤں کے درمیان پھکیاں لیتی۔

ایک بار پھر ہارن ہوا۔ اب بھی اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد نپٹے

قلبت کا دس بارہ سالہ حامد اوپر آ گیا۔

”ہاجی دھنک آپکو کوئی نیچے بار ہا ہے۔“

اس نے سنبھلے سے ہی چہرہ رگڑ کر آنسو نکل گئے۔ اچھا تھا فرزانہ ہاتھ روم میں تھی۔ نہ

چاہے ہوئے بھی وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ نیچے آنے لگی۔ کہ فرزانہ یا پھر یہ حامد یا اسکے گھروالے کیا

سوچتے کون آیا تھا جسے وہ ملنے سے کتر رہی تھی۔ نہ جاتی تو بیویوں باتیں ہنستیں۔

وہ ہانسنے سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آگئی۔

چپ چاپ۔ بولنے کو تھا بھی کیا؟

”آؤ بیٹھو گاڑی میں۔“ وہ متانت سے بولا۔

دھنک کے بکھرے بال، بیگیا بیگیا چہرہ، سرخ متورم آنکھیں بتا رہی تھیں جو اس پر بیٹ

رہی تھی۔

وہ چپ رہی۔ سوائے ایک گہری سی سانس کے۔

”بیٹھو نا۔“ اس نے اصرار کیا۔

”جو بات کرنی ہے ادھر ہی کر دیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ آخر وہ بول ہی پڑی۔ لہجہ بکھر

اور۔۔ فخر عالم نے گہری سانس لی۔
 ”اوکے۔ گڈ ٹائیٹ۔“ اس نے اسکا ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔
 ”گڈ ٹائیٹ۔“ وہ بھی ہولے سے بولی۔
 اور گاڑی سے نکل کر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے قلیٹ کی طرف بڑھی۔

”چند ماہے فخر عالم اپنے اسی ہاتھ کو بند کرنا کھولتا رہا۔ گھورتا رہا اسے۔ جیسے اپنے کے
 پر پچھتار ہا ہونا نام ہو۔
 پھر۔ آہستہ سے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اسکے احتجاج کے باوجود سینے سے
 بھینچ لیا۔ اسکی نہیں نہیں کے باوجود اسکے ماتھے پر ہونٹ رکھ دیئے۔
 ”میں ہی تمہارا سب کچھ ہوں۔ صرف تمہارا ہوں۔ کل بھی تھا، آج بھی ہوں، اور ہمیشہ
 رہوں گا۔۔۔“ وہ کہتا رہا۔

اور۔ اسکے پیار میں بے بس دھنک انداز خود سپردگی لئے اسکے بازوؤں میں مقید پھوٹ
 پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اپنا فیصلہ پھر بھلا کر، اپنا ارادہ رقطع تعلق پھر بھول بھال کر۔
 کیا تھا اس میں۔ جو چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے تعلق توڑ نہ پار ہی تھی۔
 ”اچھا اب مسکرا دو پلیز۔“ اسکا بھیگا بھیگا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔
 وہ چپ رہی۔ اب بھی سواندیشے، سوشکوے تھے سرخ متورم آنکھوں میں۔
 فخر عالم نے باری باری اسکی دونوں آنکھوں پر پیار کیا۔
 ”مسکرا دو نا۔“

اور وہ۔ انفر دگی سے مسکرا دی۔
 یہ بھی بہت تھا۔ فخر عالم نے اسے پہلو سے لگائے لگائے گاڑی سٹارٹ کی۔ آبادی سے
 باہر نکل کر کافی دیر تک ادھر ادھر بے مقصد گاڑی دوڑاتا رہا۔
 آخر کار۔ پھر اسے اسکے قلیٹ پر لے آیا۔
 ”زیادہ سوچا نہیں کرو۔ ہوں۔“
 وہ پھر ہولے سے مسکرا دی۔ بے یقینی سے، بے اعتمادی سے۔
 ”مجھ پر بھروسہ نہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

سو ساری
 ڈاٹ کام

وہ بھی چل دیا۔ واقعی دیر ہو رہی تھی اسے۔

دھنک تیار ہوئی۔ آفس جانے کیلئے بس سٹاپ پر آئی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ کہ سامنے سے جیب آتی دکھائی دی۔ وہی جیب تھی جو کچھ دیر قبل فلیٹس کے گیٹ کے پاس کھڑی تھی، جس میں فخر عالم تھا اور جس نے ہارن دیکر اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ جیب پاس سے گزرنے لگی تو اس نے دیکھا جیب ڈرائیور چلا رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر فخر عالم تھا اور فخر عالم سے چٹھی۔ وہی لڑکی بیٹھی تھی۔

دھنک کو فخر عالم کے دورخی رویے پر غصہ کی بجائے افسوس ہونے لگا۔ کہ غصہ تو پہلے بھی اسے کئی بار آچکا تھا۔ دکھ بھی ہوا تھا۔ مگر۔

اس وقت افسوس ہو رہا تھا۔ اتنی باوقار شخصیت، اتنا بڑا آدمی، اتنا نامی گرامی خاندان۔ اور اتنی اوجھی حرکت۔ بیک وقت دو لڑکیوں کیساتھ معاشرت!

اور کیا پتہ۔ وہ طنز سے ہنس دی۔ دو سے بھی کہیں زیادہ لڑکیاں ہوں۔ جنہیں وہ بیک وقت Handle کر رہا تھا۔

اس نے گہری سانس لی۔ پھر سر جھٹک دیا۔

یہ آدمی کم از کم اسکی سمجھ سے باہر تھا!

بس آئی اور وہ بیٹھ کر آفس چل دی۔

”آئیے مس دھنک تشریف لائیے۔“ اسے دیکھتے ہی آصف بولا۔

وہ مسکرا دی۔

”کیوں۔ کوئی خاص خبر ہے کیا۔“

”ہاں۔ وہ جو تمہارا دشمن تھا نا۔ مسٹر فخر عالم۔ آجکل اس کیساتھ ایک لڑکی گھومتی پھرتی

نظر آتی ہے...“

دھنک کا دل دھڑک اٹھا۔ کہیں وہ خود دھنک پر تو چوٹ نہیں کر رہا تھا؟

صبح کی نماز سے فارغ ہو کر وہ فلیٹ کے آگے برآمدے میں نکل آئی۔ صبح کی سپیدی میں تقدس جھٹک رہا تھا۔ سامنے موٹیا کی بیل میں بس اکا دکا پھول ہی کھلے تھے۔ سفیدے کے درختوں کے پتے تلخے ہو رہے تھے۔ خزاں پر پھیلانے چھا جانے کو تیار تھی۔

مختصر سا ہارن ہوا اور اسکی محویت ٹوٹی۔

دیکھا میں گیٹ سے قدرے پرے فخر عالم کی جیب کھڑی تھی۔ اکیلا تھا۔ اسے ہی متوجہ کرنے کو ہارن دیا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اسکے قدم سڑھیوں پر اترنے کو بڑھے۔

”میں جا رہا ہوں پہاڑ پر۔ رات ہی مینیجر کا فون آیا تھا کچھ ضروری کام ہیں دیکھنے کو۔ سوچا تمہیں بتانا چلوں۔ ورنہ پھر نہ پھلا بیٹھو گی۔“ وہ خوش گواری سے بولا۔

”کب واپس آئیے گی؟“ اس نے یوں ہی پوچھ لیا کہ اب اسکا دل کسی خاص خوش فہمی میں جمانا تھا۔

”جلدی آؤنگا۔ پرسوں تک شاید۔ تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں کہیں۔“

وہ مسکرا دی۔ باوجود کوشش کے مسکراہٹ کا طنز چھپانہ سکی۔

”اچھا چلتا ہوں دیر ہو رہی ہے۔ ہاں۔“ اس نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔ ہائے۔“ وہ مڑنے لگی۔

اور فخر عالم۔ مسکرا دیا۔ کچھ افسردہ سا۔ کہ وہ کسی طرح اسکے پیار پر یقین کرنے کو تیار نہ

تھی۔

”بابائے۔ سی یو۔“

”ہاں۔ کل آئینکے پھر۔“ دھنک نے کہا۔
اور دونوں موٹر بائیک پر بیٹھ کر چل پڑے۔

سو ساری
کام

”کون لڑکی؟“ وہ آہستہ سے بول پائی۔

”یہی تو پتہ کرنا ہے وہ کون ہے؟ مسز فخر عالم کا اس سے کیا رشتہ ہے؟ میگزین سچ جا رہا
اس خبر سے۔ اتنا نامی گرامی اور ڈشنگ شخص ایک لڑکی کو لئے لئے پھرتا ہے۔ کیا اس سے
شادی تو نہیں کرینو والا؟ دونوں کی تصویر بھی ہو جائے...“
”چھوڑ دو بھی۔ یہ اسکا پرسنل معاملہ ہے“ وہ بمشکل بولی۔

”اوں ہوں۔ وہ ملک کے گنے پنے امیروں میں سے ہے جس نے کئی فلاحی ادارے
کھول رکھے ہیں۔ جو قوم کی خلوس دل سے خدمت کرتا ہے۔ ہیرو ہے قوم کا سو پبلک پراپرٹی
ہوئی نا۔ اسکی ہر Activity پتہ چلنا چاہیے قوم کو...“
”اسکو چھوڑ دو کوئی اور بات کرو۔“

”کیسے چھوڑوں۔ پتہ ہے جب سے اصلی مجرم پکڑا گیا ہے۔ لوگوں کو کتنی ہمدردی ہو گئی ہے
اس کیساتھ۔ کوئی اسکی سٹیٹنگ پر سینیٹی کی بات کرتا ہے تو کوئی اسکی وسیع القلمی کی۔ لڑکیاں
ہر طرح سے تجسس ہیں اسکے بارے میں کچھ جاننے کو...“

”چپ بھی کرو۔ عالم۔ عالم۔ عالم۔ اور کوئی جیسے ہے ہی نہیں اس دنیا میں“۔ اسکا جیسے
”Topic سے مر پھٹے گا۔“

”گتے تمہارا دھنسی ابھی تک جاری ہے پچارے سے“۔ وہ کچھ حیران سا بولا۔

”بل جلد سے لہاب ٹھوڑا ہے گدا گروں کی تلاش میں۔ سرنے کہا تھا جلدی مکمل
گتے ترنگی۔“

”مغصے تمہارے سامنے۔“

”مجھ کو مجھ سے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”گتے تمہارا دھنسی ابھی تک جاری ہے پچارے سے۔“ وہ کچھ حیران سا بولا۔
”بل جلد سے لہاب ٹھوڑا ہے گدا گروں کی تلاش میں۔ سرنے کہا تھا جلدی مکمل
گتے ترنگی۔“

”مغصے تمہارا دھنسی ابھی تک جاری ہے پچارے سے۔“ وہ کچھ حیران سا بولا۔

درمیان میں رکھی میز پر سیدھی پھیلا دیں۔
دھنک اسکے پاس سے گزر کر اپنی کرسی کی طرف جانے لگی۔
فخر عالم نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ اپنی کرسی کے بازو پر بٹھالیا۔
”سناؤ۔ کیسے رہیں اتنے دن؟“ اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ اپنائیت سے

بولی۔

”ٹھیک“

”ٹھیک تو نہیں لگ رہیں۔“

اسکے چہرے پر اداسی کی گہری چھاپ چھپ تو نہیں سکتی تھی۔

وہ چپ رہی۔

”بولو نا۔ باتیں کرو نا۔ بہت سی ڈھیر ساری۔ میں تو ترس گیا تھا اتنے دن تمہاری آواز کو۔“

”اچھا۔“ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ طنزیہ اداس مسکراہٹ۔

”میں نے دوبار تمہیں فون بھی کیا تھا مگر تم اپنی ڈیوٹی کے سلسلے میں کہیں باہر نکلی تھیں۔

تمہیں نہیں بتایا کسی نے؟“

”اوں ہوں۔“

”Hell... اتنی مشکل سے تو وہاں سے کال بک ہوئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ اداس سی مسکرا دی۔ ”کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”کیوں طنزیہ طنز کر رہی ہو۔ میں بچہ ہوں جو نہیں سمجھتا۔“ وہ اچانک بھراٹھا۔ ”میں

جلدی اسلئے نہ آسکا کہ میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ڈاکٹر آئی کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔“ اسکا

خیال تھا وہ اسکی دیر سے آمد پر خفا ہے۔

”میں نے کب کہا آپ دیر سے آئے ہیں۔“ دھنک کالب دلجو اب بھی وہی سگنی لئے تھا۔

”تم نے نہیں کہا میں تو محسوس کرتا ہوں نا۔“ اسکا دلجو اب بھی تیز تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ ذہن پر بوجھ مت ڈالیں۔“

دن مختصر تر ہوتے جا رہے تھے۔ گلابی دن ڈھلتے ہی سیندھری شامیں اتر آتی تھیں۔ یونما
ہانڈی اور ہوا کے جھونکے موسم کو سرد بنا رہے تھے۔ سردی۔ جسکا تصور ہی اس کی روح میں
خوشیوں کی لہر دوڑا دیتا تھا۔ اب کے کچھ اداس اداس تھی، افسردہ افسردہ تھی۔

کافی دن ہو گئے تھے اسے فخر عالم کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ نہ کوئی فون آیا تھا نہ وہ خود۔ نہ ہی
دھنک نے فون وغیرہ کر کے اسکا پتہ کیا تھا۔ گو وہ فخر عالم کو دل سے نکال نہیں سکتی تھی مگر خود
سے ملنا ملنا پتے لگانا۔ یہ بھی سب اس نے چھوڑ دیا تھا۔

کچھ عرصہ قبل وہ کتنی شوخ و چنچل، چاق و چوبند ہوا کرتی تھی۔ حاضر دماغ حاضر جواب۔

پر اب تو۔۔۔ جیسے اپنے آپکو گھسیٹ رہی تھی۔ خوبصورت چہرے پر اداسی کی مستقل چھاپ
لگ گئی تھی۔ لاکھ خود کو مصروف رکھتی مگر دل تھا کہ۔۔۔ بچھ کر رہ گیا تھا۔

آج وہ رسالے کے دفتر نہیں گئی تھی۔ بہت تھکا تھکا سا محسوس کر رہی تھی۔ رات کے
کپڑوں میں آرمڈ چیر پر کھلی کھڑکی کے قریب بیٹھی باہر خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

دفتر دروازے پر دستک ہوئی۔

بادل خواستہ وہ اٹھ کر دروازے پر گئی۔ کھولا۔

فخر عالم تھا۔ مجسم اشتیاق، مجسم خوشی!

چہرے پر خوشی کی دمک، ہونٹوں پر دلآویز تبسم!

”آپ... آپ کیسے...؟“ وہ کچھ حیران سی ہوئی۔

”تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہارے آفس فون کیا۔“ وہ اندر آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”پتہ چلا تم نہیں آئیں۔ میں ادھر آ گیا۔“ وہ آرام سے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ماتلیں

"دھنک۔ میں۔ مجھے ان ڈائریکٹ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ صاف صاف بتاؤ اگر میری دیری پر نہیں تو پھر کس بات پر خفا ہو۔"

"میں... مجھے بھی ایسا آدمی پسند نہیں جسے کوئی اور بھی پسند کرتا ہو۔"

"اوہ۔ اسکا جیسے ذہن سے بوجھ اتر گیا۔ اور ساتھ ہی کہ وہ جان گئی تھی کہ فریدہ اس کیساتھ تھی۔"

"وہ... لڑکی کون ہے؟"

"وہ چپ رہا۔ خاموشی سے اسے تکتا رہا۔"

"گرل فرینڈ ہے؟"

"وہ اب بھی چپ تھا۔"

"آپکا اچھی لگتی ہے؟"

"اور وہ۔ اب بھی خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔"

"اسکی خاموشی ان باتوں کی تصدیق نہیں تو اور کیا تھی؟"

"دھنک ہاتھ چھڑا کر اٹھنے لگی۔"

"مگر۔ فخر عالم کی گرفت مضبوط تھی۔ آہستہ سے اسکا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔"

"مجھے تم اچھی لگتی ہو اور بس۔" پرکشش لب اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے وہ دھیسے لہجے

میں بولا۔ "میری تم ہو صرف تم۔ اور کوئی نہیں ہے..."

"فخر عالم کی مخصوص مہک دھنک کو اپنی سانسوں میں اترتی محسوس ہوئی۔ وہ پھر اپنی خفگی بھول

رہی تھی۔ پھر اسے چاہنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ کتنی بے بس تھی وہ فخر عالم کے سامنے۔"

"یہاں کیا ہوا؟" وہ فخر عالم کے ماتھے پر لگے زخم کے اوپر چھوٹی سی چوکور پٹی کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"شکر ہے تمہیں خیال تو آیا۔" پھر آستین اوپر کی۔ بازو پر لگے زخم اسے دکھائے۔

"یہاں بھی زخم آئے تھے۔ مانگوں پر بھی آئے تھے..."

"کس طرح ہوا ایکسڈنٹ؟" وہ وہیں اسکے سینے سے لگی بیٹھی تھی۔

وہ جیسے کچھ سوچنے لگا۔ کچھ اکٹھا کرنے لگا۔ کڑیاں جوڑنے لگا۔

پھر۔ گہری سانس لی۔ پھر مسکرا دیا۔

"میری جیب کی بریکس فیل ہوئی تھی۔" اس نے اتنا ہی کہا۔

"مگر... وہ پریشانی میں سیدھی ہو بیٹھی۔" آپ پوری بات تو بتائیں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ وہی مخصوص دل میں اترنے والی ہنسی۔

"میری گورنس کا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ یہ فریدہ نے فیل کروائی تھی۔"

"فریدہ کون؟"

"وہی لڑکی۔ جو تمہیں اچھی نہیں لگتی۔"

"وہ کیوں کرتی ایسا؟" وہ تو فخر عالم کو بہت چاہتی تھی جیسے۔

"یہی تو میں کہتا ہوں۔" وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

دھنک چپ سی ہو گئی۔

"ماما کا خیال ہے۔ میری جان کے پیچھے کوئی لگا ہوا ہے۔ پہلے میری ہی غلطی میں سمینہ

کو مار ڈالا۔ سمینہ کا منگیتر میرا ماموں زاد ہے۔ میری Step Mother کا بھتیجا ہے۔ وہ

جیل گیا تو اب فریدہ میری زندگی کے پیچھے لگ گئی ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ ماما کہتی ہیں یہ

سب ایک ہی سکیم کی کڑیاں ہیں۔ پہلے بابا کو زہر دیا گیا۔ اس وقت تو میں سویٹزر لینڈ میں تھا۔

کچھ کہہ نہیں سکتا سچ تھا یا غلط۔ اب میری ٹھیک ٹھاک شکار پر تیار جانے کیلئے جیب کی بریکس فیل

کرادی گئیں۔ میری عادت ہے سفر پر جانے سے پہلے میں گاڑی اچھی طرح چیک کرتا ہوں۔

اس وقت واقعی سب ٹھیک تھا۔ پھر لمحوں میں پتہ چلا بریکس فیل ہیں۔ تب میں چل پڑا تھا۔

گاڑی کسی طرح قابو نہیں آرہی تھی۔ پہاڑی راستے کی چکر دار سڑکیں، اترائی۔ مجبوراً گاڑی

پہاڑے سے ٹکرانا پڑی۔ تبھی جا کے کہیں رکی۔ بس مرا نہیں۔ یہ دیکھو زندہ ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"وہ لڑکی آپ کیساتھ نہیں تھی؟" جبکہ وہ فخر عالم کو لمحہ بھر کو اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔

”یہ ایک پوائنٹ سٹرائیک کرتا ضرور ہے کہ پروگرام اسکا بھی ساتھ چلنے کا تھا۔ میں نام پر طبیعت کی خرابی کا کہہ کر وہ نہیں گئی۔ بہر حال ماما کہتی ہیں کہ یہ سب اس خاندان کو ختم کرنے کی چالیں ہیں۔ پہلے بابا پھر میرے بدلے میں سمینہ — اب پھر میرے پیچھے کوئی لگا ہے۔ ہمہ... یہ پیسہ کیا چیز ہے۔ زندگی تک محفوظ نہیں رہتی۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں یہ سب چھوڑ چھوڑ کہیں نکل جاؤں۔ جہاں خلوص ہو، سچائی ہو، سچی محبت ہو۔ بعض اوقات مجھے اپنا آپ بہت تنہا محسوس ہوتا ہے اکیلا۔ ہوں نا اکیلا۔“

دھنک نے دیکھا اسکی خوبصورت آنکھوں میں اداسی اتر آئی تھی، دکھ در آیا تھا! اسکی اداسی، اسکا دکھ، دھنک کو اپنی روح میں اترتے محسوس ہوئے۔ اسکی زرین آنکھوں میں سرخ سنہری رنگ دھواں دھواں ہونے لگے۔ اور — کنارے بھیگ بھیگ گئے۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

اور — دو موٹی لڑھک کر اس کے خوبصورت گالوں پر آ رہے۔

”تم ابھی سے رونے لگیں۔“ افسردہ سی مسکراہٹ سے اس نے اپنی انگلیوں سے اسکے آنسو پونچھے۔ ”ابھی تو کئی امتحان اور ہیں۔ تم میرے ساتھ ہوگی تو ہر مشکل آسان ہو جائیگی۔ میرا ساتھ دوگی نا!“

”ہاں۔“ اس نے اب بھی صرف سر ہی اثبات میں ہلایا۔ کہ زبان ساتھ ندے پار ہی تھی۔

”بس پھر سب ٹھیک ہو جائیگا۔ میں تمہیں خود کسی دن سب بتا دوں گا... اور اب اٹھو شاپاش۔ کوئی پلاؤ۔“

اور وہ انگلیوں کی پوروں سے آنکھیں خشک کرتی کچن کی طرف چل دی۔

سردی زوروں پر تھی — دن گھٹ گئے تھے، راتیں طویل۔ ادھر دن نکلتا تھا ادھر شام اتر آتی تھی۔

سامنے کیاری میں کھلے زمرس بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ گل داؤدی اپنے جوہن پر تھی جبکہ — کونے والے اونچے درخت سے لپٹی Morning Glory اکا دکا پھول لئے سردی کی شدت کے سامنے بے بس نظر آرہی تھی۔

برآمدے سے اندر آ کر وہ جلدی جلدی آفس جانے کیلئے تیار ہونے لگی۔ آفس پہنچ کر اپنے ڈیسک پر بیٹھی ہی تھی کہ سامنے رکھے فون کی کھنٹی بج اٹھی۔

آصف نے اٹھ کر ریسیو کیا۔

دھنک کی توجہ ادھر ہی لگی تھی۔ کہیں فخر عالم کا تو نہیں تھا؟ کہیں آصف نہ سمجھ جائے سب؟

”کوئی صاحب تمہیں پوچھ رہے ہیں۔“ آصف نے ریسیور ایک طرف رکھتے ہوئے اسے کہا۔

وہ جلدی سے اٹھی۔ فخر عالم کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔

اسکا دھڑکتا دل سنجھل گیا۔ اب فخر عالم اتنا بھی بیوقوف نہیں تھا کہ رسالے کے دفتر میں اپنی شناخت کرواتا۔

اس نے ریسیور کان سے لگا لیا۔

”ہیلو — فخر عالم بول رہا ہوں۔“

”پتہ ہے۔“ وہ مسکرا دی۔

”ہاں نا۔ بچارا میرا دل جو تمہارے پاس ہے دھڑک کر بتا دیا ہوگا کہ فخر عالم ہے بدلے

بعد پھر رنگ کرینگے۔“ آصف ہر بات میں اسی طرح اسے چھیڑا کرتا تھا۔
 ”ہوں۔“ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے ڈیسک پر رکھی فائل کھول لی۔
 ”مس دھنک۔“

”جی۔“

”میری سکیم فیل ہوگئی۔“ وہ مسکین سی شکل بناتے ہوئے بولا۔
 ”کون سی سکیم؟“

”وہی۔ مسز فخر عالم کے متعلق پتہ کرنا کہ وہ کس لڑکی کو ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے۔“
 ”میں نے تمہیں کہا تھا خواہ مخواہ کسی کے پرائیویٹ معاملات میں دخل مت دو۔“

”مسز عالم کے معاملات پرائیویٹ کہاں ہیں۔ پرنس کا پرنس ہے۔ یہ دیکھو اخبار میں
 کیا لکھا ہے۔ عام آدمی ہوتا تو یوں اس کے متعلق خبریں چھپتیں۔ میرے تمہارے بارے
 میں کوئی کیوں نہیں لکھتا۔۔۔“ اس نے اخبار کی ایک خبر اسکے سامنے کی۔

سکیننگ کرتے ہوئے کسی نامعلوم شخص نے اسے دھکا دیا تھا۔ جسکی وجہ سے وہ نیچے تک
 لڑھکتا ہوا چلا گیا تھا۔ نامعلوم شخص سکیننگ ہی کے لباس میں بظاہر سکیننگ کر رہا تھا۔ مگر پھر
 غائب ہو گیا۔ وہ مقابلے میں حصہ لینے والوں میں سے نہیں تھا۔ لگتا تھا باہر سے اسی مقصد
 سے آیا تھا کہ مسز عالم کو کسی طرح ختم کر دے۔ مگر باوجود شدید زخمی ہونے کے انکی جان بچ گئی۔

معاذون کی گھنٹی بجی۔ اور دھنک جلدی سے اٹھی۔ ریسیو کیا۔

فخر عالم ہی تھا۔ ہسپتال سے بول رہا تھا۔ اسے آنے کو کہا تھا۔

”آصف میں جا رہی ہوں ذرا کام ہے۔ کوئی پوچھے تو کہنا ہسپتال گئی ہے۔“ وہ اپنا

بیگ کندھے سے لٹکاتی ہوئی جانے لگی۔

”سنو۔“ آصف سنجیدگی سے بولا۔

”کیا ہے؟“

”ان حضرت سے صاف صاف کہہ دینا میں تمہارا امیدوار ہوں۔ خواہ مخواہ نمبر بنانے

میں دل مانگ رہا ہے۔“
 ”وہ تو میں کبھی کا دے چکی آچکی۔“
 ”I am lucky then.“

”اور کیسے ہیں آپ؟“

”فرٹ کلاس۔ بس تمہیں یہ بتانا تھا کہ میں گیارہ بجے روانہ ہو رہا ہوں سکیننگ
 کمیشن پر۔“

اور۔ دھنک کا دھیان یکدم فریدہ کی طرف گیا۔

”اور کون جا رہا ہے ساتھ۔“

”کوئی نہیں۔ تم ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ اوکے چلتا ہوں۔ ہاں۔“

”Take care.“ وہ کھلا سی گئی تھی۔

ریسیور واپس کریدل پر رکھ دیا۔ تھکے تھکے سے قدم اٹھاتی ڈیسک پر آ بیٹھی۔

کیا وہ اسی طرح فخر عالم کیساتھ اس لڑکی کو قبول کرتی رہے گی؟ کون تھی وہ؟ کیا لگتی تھی

فخر عالم کی؟ ادھر فخر عالم دھنک سے پیار کرتا تھا ادھر اس سے بھی مجبور تھا۔ عجیب معمہ تھا۔

اور یہ پہلی بار تھی کہ اس نے فخر عالم سے قطع تعلق کا نہیں سوچا۔ شاید اسے فخر عالم کی محبت
 کا یقین آ گیا تھا! شاید وہ جان گئی تھی کہ اس لڑکی سے اسکا جو بھی رشتہ تھا دھنک کے پیار سے
 زیادہ نہیں تھا؟ مگر۔

یوں دن رات اکٹھے گزارنا؟

وہ کب تک ہے گی یہ آگ؟

دن آہستہ آہستہ سرک رہے تھے۔ دس بارہ دن ہو چکے تھے فخر عالم کو گئے۔ ابھی تک شاید
 وہ واپس نہیں آیا تھا۔ اس نے بھی جانتے سے اس سے پوچھا نہیں تھا کہ وہ کب لوٹے گا؟
 آج وہ قدرے دیر سے دفتر پہنچی۔

”تمہارا فون تھا۔ وہی صاحب لگ رہے تھے اس دن والے۔ فرماتے تھے تھوڑی دیر

فحص لباس تو سکیمیر کا ہی پہنے تھا مگر ٹیم میں شامل نہیں تھا کوئی اجنبی تھا۔ اور اسکے فوراً بعد کہیں
 تائب ہو گیا۔ "وہ دھیرے دھیرے بتا رہا تھا۔" میں اتنے شوق سے گیا تھا۔ سکیمپنگ میں میری
 جان ہے۔ مگر چلو... رہنے دو۔ تم بتاؤ کیسی رہیں اتنے دن ہاں۔"
 "ٹھیک۔ آپ بتا کر بھی نہیں گئے تھے کہ کب واپس آئیے۔"
 "سوری۔ مجھے واقعی خیال نہیں رہا تھا۔ تم ہی پوچھ لیتیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
 "سوری۔ مجھے واقعی خیال نہیں رہا تھا۔ آپ ہی بتا دیتے۔" وہ بھی مسکرا رہی تھی۔
 دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

"اس بوتل میں سے دو گولیاں دینا ذرا پلیز!" فخر عالم نے قریبی میز رکھی کئی دوائیوں میں
 ایک چھوٹی سی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔
 دھتک انھی۔ اس بوتل میں سے دو گولیاں نکال لیں۔ سفید رنگ کی چھوٹی چھوٹی گولیاں
 تھیں۔ پھر تھرمس میں سے گلاس میں پانی اٹھایا۔ اسکے پاس آئی۔ آہستگی سے اس کے سر ہانے
 بیٹھتے ہوئے اسکے سر کو سہارا دیکر قدرے اوپر کیا اور گولیاں دیتے ہوئے پانی کا گلاس اسکے منہ
 سے لگا دیا۔

اسے یہ سب کرتے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جبکہ فخر عالم تھا کہ جیسے دونوں جہان کی
 خوشیاں اکٹھی مل گئی تھیں ساری۔
 گولیاں لیکر اس نے اپنا سروہیں دھتک کی گود میں رکھ دیا۔
 "اسی طرح بیٹھی رہو دھتک پلیز!" وہ اسکا ہاتھ ہونٹوں سے لگائے تھا۔ "مجھے دنوں
 بعد سکون مل رہا ہے۔ یہیں رہو پلیز! کہیں مت جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ..."
 دھتک آہستہ سے جھکی۔ ہولے سے اپنے ہونٹ اسکے پٹی لگے ماتھے پر رکھ دیئے۔ چپکے
 سے کچھ بھی بولے بغیر۔

"بولو۔ رہو گی نامیرے پاس۔" وہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ نشلی نیم وا آنکھوں

۔

کی کوشش نہ کریں۔"
 اور۔ دھتک نے اسے خشکیں نظروں سے گھورتے ہوئے گہری سانس لی۔

مقامی ہسپتال میں دی وی آئی پی روم میں وہ روم نمبر ۳ میں ایڈمٹ تھا۔ دروازے پر
 دھتک دیتے ہوئے اسے خیال آیا وہ لڑکی بھی وہاں ہو سکتی تھی۔
 "بس۔" فخر عالم کی آواز آئی۔

"سفید خوبصورت پھولوں کی Bouquet لئے وہ اندر داخل ہوئی۔
 کوئی نہیں تھا کمرے میں۔ بس فخر عالم تھا۔ کمزور چہرہ، نقاہت لئے آنکھیں۔
 Bouquet اسکے ہاتھ سے لیکر فخر عالم نے اسے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے اپنے قریب
 بیڈ پر بٹھالیا۔
 "کب سے ایڈمٹ ہیں یہاں۔" دھتک کی خوبصورت آنکھوں میں قوس و قزح کے
 رنگ ڈولنے لگے۔ کنارے بھیگ گئے۔

"آج چوتھا دن ہے۔"
 "اور مجھے آج بتایا۔"

"میں فون کرنے کے قابل نہیں تھا۔ پھر اتنے لوگ آتے رہے۔ میں نہیں چاہتا تھا
 تمہیں دیکھ کر کوئی غلا سوچے، سیکنڈ لڑ بنیں۔ یقین کرو تم ہر لمحہ دل میں رہیں۔ کل سوچا ماما سے
 کہوں تمہیں بتا دیں۔ پھر سوچا پتہ نہیں کس طریقے سے بتا دیں اور تم گھبرا جاؤ..."
 "اب کیسی طبیعت ہے؟" وہ اسکے ماتھے اور ہاتھوں پر بندھی پٹیوں کو دیکھ رہی تھی۔
 "کیسے ہوا یہ حادثہ؟"

"معلوم نہیں۔" وہ جیسے کچھ سوچنے لگا۔ "مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔ بس اتنا یاد ہے کوئی
 سکیمیر میرے پاس سے گزرتے ہوئے اتنے زور سے مجھ سے لکرایا کہ میں اپنا توازن برقرار
 نہ رکھ سکا۔ لڑھکتا چلا گیا۔ پھر۔ کوئی ہوش نہیں رہا۔ بعد میں ٹیم کے لوگوں نے بتایا کہ وہ

وہاں کوئی وزیر نہیں آیا۔ پھولوں کے ان گنت گلدستے البتہ سامنے کی چوڑی گھڑکی میں لگے تھے۔ شاید اسکے آنے سے قبل اسے پوچھنے والے لوگ آئے تھے۔ یا شاید کل شام آنے والے لوگ لیکر آئے تھے۔

”اب چلوں۔“ گواسکا دل اسے اکیلا چھوڑنے کو نہیں کر رہا تھا۔
 فخر عالم نے گھڑی دیکھی۔ ہارہ بیچ چکے تھے۔ اس وقت کوئی نہ کوئی ضرور آتا تھا۔ میرا
 کھانا لیکر یا پھر ماما اپنا سوشل سوپ لیکر۔
 ”ٹھیک ہے۔ ویسے آج شام مجھے ڈسچارج کر رہے ہیں۔ مگر جاؤ گا انشاء اللہ۔ وہاں
 آنا پھر۔“

”اوکے۔ فیک کیئر۔“ وہ چلنے لگی۔

”ہائے۔“ وہ بولا۔

اور دھنک آہستہ سے دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گئی۔

وہ گڑبڑ اسی گئی۔ پھر خود کو سنبھالا۔

”ایسا کوئی قانون میری نظروں سے نہیں گزرا جس کے تحت ایک لڑکی کسی لڑکے کیساتھ

اکٹھی رہ سکے۔“ اس نے اسے چھیڑا۔

”اگر ہم دونوں شادی کر لیں پھر تو رہ سکتے ہیں نا۔“

”آپ... تمہوڑا سنا پانی اور پی لیں۔ بکنے لگے ہیں آپ۔“ اس نے قریب ہی رکھے

تھرمس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

فخر عالم نے اسکا ہاتھ وہیں روک دیا۔ اس کی گود میں اب بھی سر رکھے تھا۔

”بس ایسے ہی بیٹھی رہو۔ ہلنا نہیں۔“

”اور... اور کہیں وہ لڑکی آگئی تو؟“ دھنک کو خدشہ ضرور تھا۔

”آگئی تو آگئی۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔

”کیا جواب دینے لگے اسے۔“

”کہہ دوں گا میں اس سے شادی کر نیوالا ہوں۔“

”ہوں؟“ وہ مسکرا دی۔

”ہاں۔ دیکھ لیتا۔“ وہ دھنک کی طرف دیکھنے لگا۔ ”تمہیں پتہ ہے ماما کا اب بھی وہی

خیال ہے کہ جس آدمی نے مجھے دھکا دیا تھا وہ فریدہ کا ہی آدمی تھا۔“

”کیوں؟ اس سے فریدہ کو کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟“

فخر عالم نے ایک گہری سانس لی۔

”یہ باتیں اتنی زیادہ اور اتنی لمبی ہیں کہ... اور پھر میرے سر میں کچھ ہونے لگتا ہے یہ

سب دہراتے ہوئے۔“ اسکے پرکشش نقوش اب بھی سایوں کی زد میں آگئے۔

”رہنے دیں۔ اور باتیں کرتے ہیں۔“

”ہاں پلیز!“ اس نے جیسے نجات کی سانس لی۔

وہ کافی دیر وہاں فخر عالم کے پاس رہی اسکی دلجوئی کرتی رہی۔ تسلی دیتی رہی۔ اس دوران

”ہیلو“۔ وہ دھیرے سے بولی۔

اور۔ اتنے میں ماما طوفان باد و باران کی طرح اندر داخل ہوئیں۔

”اے بیٹی۔ میرے بچے کو سنبھال۔ مار دے گی کسی دن وہ کبھت لڑکی۔ ہاتھ ملتے رہ جائینگے ہم سب۔ پہلے جیب کی بریکیں نکل کروائیں۔ پھر موٹی سلکیونگ میں دھکا دیکر مارتا چاہا۔ اور یہ تھا کہ یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ اب دیکھو...“ انہوں نے دوائی کی ایک چھوٹی سی شیشی اسے دکھائی۔ ”رات میں فخر عالم بیٹے کے ڈریسنگ روم میں دھوبی سے آئے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی کہ یہ آن دمکلی۔ میں باہر نہیں آئی زہر لگتی ہے مجھے۔ بے حیاؤں کی طرح چومتی چاٹتی رہتی ہے میرے بچے کو۔ کافی دیر گزر گئی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

میں نے آہستہ سے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ یہ چلی گئی ہو تو میں نکل آؤں مگر توبہ کرو ایک بار آ کر وہ جانے کا نام کب لیتی ہے۔ فخر عالم لیٹا تھا اسکی طرف پیٹھ تھی اور آنکھیں موندی ہوئیں۔ فریڈہ کی طرف دیکھا تو جیسے اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اسی شیشی کی اصلی گولیاں ہتھیلی پر نکال فٹ سے دوسرے ہاتھ میں پکڑی گولیاں بھردیں۔ میں نے یہ شیشی اچھی طرح ذہن نشین کر لی۔ اور دھڑکتے دل سے پچھلے دروازے سے ہاتھ روم کے راستے باہر نکل گئی۔ ذہن اسی طرف لگا تھا۔

جوں ہی وہ گئی۔ میں نے آ کر بوتل اپنے قبضے میں کر لی۔ فخر عالم اصلی دو اسر شام لے چکا تھا۔ اب اسکی ضرورت نہ تھی۔ میں اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ رات کو اسے کچھ نہ بتایا کہ پریشان ہوگا۔ صبح فخر عالم کو شیشی دکھائی، بات بتائی۔ تب سے حیران پریشان ہے۔ بہت مکار لڑکی ہے۔ گولیاں ہو بہو اسی طرح ہیں جیسے پہلے تھیں۔ چھوٹی چھوٹی سفید۔ فرق پتہ ہی نہیں چلتا۔ مگر بدلی تو میرے سامنے ہی ہیں۔ ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ دکھاؤ گی... بیٹی میں بہت پریشان ہوں۔

پہلے ماں نہ رہی بڑے صاحب اور میں نے ہی پالا پونسا۔ پھر سوتلی ماں آئی۔ سوتلی ماں کا سلوک اسکے ساتھ بس دکھاوا ہی تھا۔ مگر یہ کونسا بار تھا اس پر۔ جلد ہی بڑے صاحب نے اسے

دھنک اسے روز صبح ہی صبح آفس جانے سے پہلے دیکھنے جایا کرتی تھی اور۔ فخر عالم کو جیسے زندگی بخش جاتی تھی۔

فخر عالم اب بھی دوائیں لے رہا تھا۔ اب پہلے سے خاصا بہتر تھا۔ گھر میں ادھر ادھر گھوم پھر بھی لیتا تھا۔ آفس یا پھر اپنی کسی لیکٹری وغیرہ پر البتہ ابھی تک نہیں گیا تھا۔

دن گزر رہے تھے۔ دھنک کیلئے دن خوبصورت اور راتیں حسین سنے لیکر آتیں۔ گودل میں اب بھی کانٹا سا چھار ہتا تھا۔ خلش اسے بے قرار رکھتی۔ فریڈہ کا اب بھی فخر عالم کے پاس آنا جانا تھا باقاعدگی سے۔ اب تو دھنک نے اسکا ذریعہ چھوڑ دیا تھا فخر عالم کے سامنے۔ کہ نتیجہ کچھ نہ نکلتا تھا۔ یا تو وہ خاموشی سے اسے تکتا رہتا، سپاٹ چہرے سے، جذبات سے عاری نظروں سے یا پھر ہمہی مسکراہٹ مدھری مسکان سے موضوع ہی بدل دیتا۔

کبھی اسکے متعلق کھل کر بات نہیں کی تھی۔ چپ سادہ رکھی تھی۔

آج وہ حسب سابق صبح صبح اسے دیکھنے گئی تو کچھ خاموشی کھلبلی مچی تھی گھر میں۔

چپ چپ سا ہنگامہ پاتا تھا، باد باسا طوفان۔

فخر عالم کے بیڈ روم پر دستک دیکر وہ آہستہ سے اندر چلی آئی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ فخر عالم شاید ہاتھ روم یا پھر ڈریسنگ روم میں تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس لگے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

تجھی ٹائیٹ سوٹ پر قیمتی گاؤن پہنے وہ ڈریسنگ روم سے بیڈ روم میں آ گیا۔

”گڈ مورنگ نیم“۔ فخر عالم جیسے پریشان تھا۔ مگر بلاش بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاس آ کر اس کے مقابل والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

خاموش تھا۔ اور وہ فخر عالم کی زندگی کی درپے تھی۔ وہ واقعی کتنا تھا تھا۔ کتنا اکیلا!
اسے یاد آیا اسی بوتل سے اس نے دو سفید چھوٹی چھوٹی گولیاں ہوسپل میں فخر عالم کو
کھلائی تھیں۔

اس نے بوتل ماما سے لی، کھولی۔ گولیاں واقعی اسی طرح تھیں۔ مگر۔ بدلی کیوں گئیں؟
”ماما۔ ہم دونوں کیلئے ناشتہ۔“ فخر عالم کو اس موضوع سے جیسے تکلیف ہو رہی تھی۔
”ابھی بھجواتی ہوں میرا بیٹا۔“ اور ماما چل دیں۔

دھنک نے نظریں اٹھا کر فخر عالم کو دیکھا۔ فخر عالم اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
پرکشش نقوش سایوں کی زد میں تھے۔ دلنشین آنکھیں فکر مند اور مبہم سی مسکراہٹ پریشان
تھی۔

دھنک بھی اپ سیٹ نظر آنے لگی۔
دونوں ہی خاموش تھے۔ جیسے کہنے سننے کو کوئی بات ہی نہ تھی۔
پھر ناشتہ آ گیا۔

دھنک دھیرے دھیرے جوس پیتی رہی۔
اور فخر عالم اپنا گلاس بڑے بڑے گھونٹ لے کر ختم کر گیا۔
اب وہ سب کھا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنے سامنے بیٹھی دھنک کو بغور دیکھ رہا تھا۔
اس وقت اسکے پرکشش نقوش سایوں کی زد میں نہیں تھے، دلنشین آنکھیں فکر مند نہ رہی
تھیں اور مبہم سی مسکراہٹ بھی پریشان نہ رہی تھی بلکہ۔

وہ تو اسے شوخ مسکراہٹ اور شریر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
دھنک کی نظریں اٹھیں۔ اس کی نظروں سے ملیں۔ اور۔
چلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

وہ واقعی کبھی کبھی اسکی نظروں کا سامنا نہ کر پاتی تھی۔
”کیا بات ہے۔“ وہ ہولے سے بولا۔

پڑھائی کیلئے باہر بھیج دیا تھا۔ اب تو جو ہوتا تھا چھوٹی بیگم صاحب، اسکے بھائی اور بہن کی
مرضی سے ہوتا تھا۔ سمینہ جوان ہوئی ہی تھی کہ چھوٹی بیگم صاحب نے اپنے بھتیجے سے اہلی
منگنی کروادی۔ ساتھ ہی فخر عالم کا فون پر اپنی اس بھانجی فریدہ سے نکاح پڑھوادیا۔ تاکہ دولت
باہر جائے ہی نہیں۔ مگر میں چھوٹی پکتی رہتی تھی۔ انہی دنوں چھوٹی بیگم صاحب فوت ہو گئیں۔
مگر اسکے بھائی بہن دندناتے پھرتے تھے مگر میں۔

پھر ایک دن اچانک بھلے چنگے بڑے صاحب انتقال کر گئے۔ لورڈین ہمارے خانساماں
کا کہنا ہے کہ انہیں زہر دیکر مارا گیا تھا۔ فخر عالم امتحان مکمل کر کے گھر لوٹا تو دوسرا حملہ اس پر
ہوا۔ مگر جیسا بوزگے ویسا کانوگے۔ اسکی غلطی میں سمینہ بی بی چلی گئی۔

تمہیں پتہ ہے کبھی اسکی جیب کی بریکیں ٹیل ہوئیں تو کبھی اسے سکیننگ میں گرایا گیا۔
ان سب کا مطلب میرے بچے کو ختم کرنا تھا۔ مگر اسے میری بات کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ چھوٹی
بیگم صاحب بھتیجے کو بیٹی دیکر دولت جائیداد بھتیجے کو دینا چاہتی تھیں اور اسی طرح اس موٹی فریدہ
کو فخر عالم سے باندھ کر باقی کی جائیداد بھی محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔

سمینہ بی بی کو تو اپنا ماموں زاد پسند تھا۔ خوش تھی منگنی سے مگر فخر عالم خوش نہیں تھا۔ اسے
اس قماش کی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ اس نے بارہا مجھ سے کہا چھوٹی امی نے مجھے کہاں پھنسا
دیا ہے۔ فریدہ بہت تیز و طرار لڑکی ہے۔ اسکے علاوہ اور لڑکوں کیساتھ بھی آزادی سے گھومتی
پھرتی ہے۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اسے فخر عالم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسکے دشمنوں کو ختم
کر کے مال ہتھیانا چاہتی ہے۔ اور شادی پھر اپنی مرضی سے کہیں اور کر لے گی۔ مگر دولت
چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔ کچھ جائیداد اسکے حق مہر میں لکھی گئی ہاتی ویسے بطور منکوحہ مل
جائیگی۔ کیونکہ فخر عالم کا اب اسکے سوا اور کوئی نزدیکی اور حقدار رشتہ دار نہیں...“

ماما کہتی گئیں اور۔

دھنک کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔

اس پر آج تمام انکشافات ہو گئے۔ فریدہ، فخر عالم کی کزن تھی، منکوحہ تھی۔ اسلئے وہ

خاموش تھا۔ اور وہ فخر عالم کی زندگی کی درپے تھی۔ وہ واقعی کتنا سجا تھا۔ کتنا اکیلا!
اسے یاد آیا اسی بوتل سے اس نے دو سفید چھوٹی چھوٹی گولیاں ہو سہل میں فخر عالم کو
کھلائی تھیں۔

اس نے بوتل ماما سے لی، کھولی۔ گولیاں واقعی اسی طرح تھیں۔ مگر۔ بدلی کیوں گئیں؟
"ماما۔ ہم دونوں کیلئے ناشتہ۔" فخر عالم کو اس موضوع سے جیسے تکلیف ہو رہی تھی۔
"ابھی بھجواتی ہوں میرا بیٹا۔" اور ماما چل دیں۔

دھنک نے نظریں اٹھا کر فخر عالم کو دیکھا۔ فخر عالم اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
پرکشش نقوش سایوں کی زد میں تھے۔ دلتیشیں آنکھیں مگر مند اور ہمہ ہی مسکراہٹ پریشان
تھی۔

دھنک بھی اپ سیٹ نظر آنے لگی۔
دونوں ہی خاموش تھے۔ جیسے کہنے سننے کو کوئی بات ہی نہ تھی۔
پھر ناشتہ آ گیا۔

دھنک دھیرے دھیرے جوس پیتی رہی۔
اور فخر عالم اپنا گلاس بڑے بڑے گھونٹ لے کر ختم کر گیا۔
اب وہ سب کھا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنے سامنے بیٹھی دھنک کو بغور دیکھ رہا تھا۔
اس وقت اسکے پرکشش نقوش سایوں کی زد میں نہیں تھے، دلتیشیں آنکھیں مگر مند نہ رہی
تھیں اور ہمہ ہی مسکراہٹ بھی پریشان نہ رہی تھی بلکہ۔۔۔
وہ تو اسے شوخ مسکراہٹ اور شریر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
دھنک کی نظریں انھیں۔ اس کی نظروں سے ملیں۔ اور۔۔۔
چلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

وہ واقعی کبھی کبھی اسکی نظروں کا سامنا نہ کر پاتی تھی۔
"کیا بات ہے"۔ وہ ہولے سے بولا۔

پڑھتی جیسے باہر بھیج دیا تھا۔ اب تو جو ہوتا تھا چھوٹی بیگم صاحبہ، اسکے بھائی اور بہن کی
مرضی سے بیٹا تھا۔ سیدہ جوان ہوئی ہی تھی کہ چھوٹی بیگم صاحبہ نے اپنے بچھے سے اسکی
منگنی کرادی۔ ساتھ ہی فخر عالم کا فون پر اپنی اس بھانجی فریدہ سے نکاح پڑھا دیا۔ تاکہ دولت
باہر جائے ہی نہیں۔ مگر میں چھوٹی بیگم صاحبہ فوت ہو گئیں۔
مگر اسکے بھائی بہن دندنا تے پھرتے تھے مگر میں۔

پھر ایک دن اچانک بھلے چنگے بڑے صاحب انتقال کر گئے۔ لو ردین ہمارے خانہ ماں
کا کہنا ہے کہ انہیں زہر دیکر مارا گیا تھا۔ فخر عالم امتحان مکمل کر کے گھر لوٹا تو دوسرا حملہ اس پر
ہوا۔ مگر جیسا بوز گے ویسا کالو گے۔ اسکی فلتی میں سیدہ بی بی چلی گئی۔

تھیں پتہ ہے کبھی اسکی جیب کی بریکیں ٹیل ہوئیں تو کبھی اسے سکینک میں گرایا گیا۔
ان سب کا مطلب میرے بچے کو ختم کرنا تھا۔ مگر اسے میری بات کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ چھوٹی
بیگم صاحبہ جیتھے کو بیٹی دیکر دولت جائیداد جیتھے کو دینا چاہتی تھیں اور اسی طرح اس موٹی فریدہ
کو فخر عالم سے بانہہ کر باقی کی جائیداد بھی محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔

سیدہ بی بی کو تو اپنا ماموں زاد پسند تھا۔ خوش تھی منگنی سے مگر فخر عالم خوش نہیں تھا۔ اسے
اس قماش کی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ اس نے بار بار مجھ سے کہا چھوٹی امی نے مجھے کہاں پھنسا
دیا ہے۔ فریدہ بہت تیز و طرار لڑکی ہے۔ اسکے علاوہ اور لڑکوں کیساتھ بھی آزادی سے گھومتی
پھرتی ہے۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اسے فخر عالم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسکے دشمنوں کو ختم
کر کے مال ہتھیانا چاہتی ہے۔ اور شادی پھر اپنی مرضی سے کہیں اور کر لے گی۔ مگر دولت
چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔ کچھ جائیداد اسکے حق مہر میں لکھی گئی ہاتی ویسے بطور منکوحہ مل
جائگی۔ کیونکہ فخر عالم کا اب اسکے سوا اور کوئی نزدیک اور حقدار رشتہ دار نہیں..."

ماما کہتی گئیں اور۔۔۔

دھنک کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔

اس پر آج تمام انکشافات ہو گئے۔ فریدہ، فخر عالم کی کزن تھی، منکوحہ تھی۔ اسلئے وہ

”صرف اسلئے کہ تم پریشان نہ ہو۔ اور فخریہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر تمہیں بتا دیا تو یہ نہ ہو کہ مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ۔ کیونکہ ایک شادی شدہ مرد میں تمہارے لئے کیا Attraction ہوتی؟“

وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

”آپ اوپر سے جتنے مصحوم لگتے ہیں اتنے ہیں نہیں۔“ اس نے فخر عالم کو چھیڑا۔
”کیا مطلب؟“

”یہی کہ۔ اگر میرے کانوں میں بھنک بھی پڑ جاتی آپ کے شادی شدہ ہونے کی تو میں آپ کے راستے میں ہرگز نہ آتی۔ کبھی بھی نہیں۔ اول تو اسلئے کہ میرا پیارا اتنا خود غرض نہیں۔ دوسرے یہ کہ مجھے دوسرے کا جھوٹا کبھی اچھا نہیں لگتا۔۔۔“
”ہوں؟“

”ہاں۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”آجکل وہ بڑا زور دے رہی ہے رخصتی پر۔“

”تو کر لیں۔“

”کر لوں۔“ وہ بغور اسکی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ جہاں سایہ سالہرا گیا تھا۔ دھندلی چھا

گئی تھی۔

”ہاں۔“

”کر لوں؟“

”ہاں۔“ اور ساتھ ہی آنکھوں میں چھائی دھندلم ہو گئی۔

فخر عالم نے گہری سانس لی۔ پھر مسکرا دیا۔

اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ دیکھ بھال کر میں کیسے ایک دشمن کو گھرا سکتا ہوں۔“

”اگر آپ کو ان گولیوں کی تہذیبی کا پتہ نہ چلتا تو آپ کر لیتے رخصتی۔“

وہ تو کافی عرصے سے اسکے پیار کا دعویٰ کرتا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے اوپر دیکھا ہی نہیں۔

”تم شرماتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔“

”میں نہیں شرماتی۔“ اور ساتھ ہی اسکا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔

بڑے دنوں بعد فخر عالم کھل کر ہنس دیا۔

”اگر تمہاری ناہمیں ہاں ہوتی ہے۔“ وہ ٹوسٹ پر شہد لگا رہا تھا۔

”آپ ناشتہ نہیں کریں گے؟“

”کر تو رہا ہوں۔“ اس نے چھری پلیٹ میں رکھ دی۔

وہ لا جواب ہو گئی۔

”تمہاری گرتی اٹھتی پلکیں مجھے سب بتا دیتی ہیں۔“ وہ پھر بولا۔

”کیا سب بتا دیتی ہیں۔“ وہ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولی۔

”کہ تم کو ہم سے پیار ہے۔“

”آپ کو نہیں ہے؟“

”اتنا کہ۔ گھبرا جاؤ گی سکر۔۔۔“

اسکی سیاہ خنیدہ پلکیں ایک بار پھر جھک گئیں۔

”دیئے بعض وقت مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے مجھے پریس والے کبھی اچھے نہیں

لگے۔ ایک رپورٹر کیسے اچھی لگنے لگی اور وہ بھی ایسی جو چھپ کر میرا تعاقب کر رہی تھی۔“

”مجھے بھی آپ کے طبعے کے لوگ کبھی اچھے نہیں لگے۔ انکا ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور ہوتا ہے۔“

”تمہیں میرے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نظر آیا۔“

”ہاں۔“

”کیا؟“

”نہی کہ پیار میں ایک دوسرے سے کچھ چھپایا نہیں جاتا اور پھر آپ نے آج تک مجھ

سے اپنا ٹکا چھپائے رکھا۔“

وہ بھی لان میں ایک چیمبر پر بیٹھ گیا۔ مگر۔
اب بھی تانوں بانوں میں الجھا تھا۔ ادھیڑ بن میں مصروف تھا۔

سو سائمی
کام

”آں۔ نہیں۔ اول تو اسلئے کہ وہ بہت ایڈوانس، الٹرا ایڈوانس ہے۔ اور مجھے عورت کی بے جا آزادی بالکل پسند نہیں۔ دوسرے یہ کہ میری شروع دن سے اس سے... وہ بات نہیں بنی۔ which is called love. I tried so but۔ شاید محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ پھر تمہیں دیکھا۔ باوجود تم پر غصہ ہونے کے تمہاری طرف کھینچتا چلا گیا۔ تو سمجھا یہی پیار ہے۔ پھر جیسے زندگی کو مرکز میں رکھا گیا۔ مگر۔ اسکے باوجود میری خوشیاں ادھوری ادھوری سی تھیں۔ اس طرف فریدہ مائے وائف۔ اس طرف تم میری محبت۔ کس کو چھوڑوں کس کو لوں؟ سارا وقت شش و پنج میں رہتا تھا۔ وہ میری ہی جان کے درپے ہوگی یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا...“ اپنے کپ سے چائے پیتا وہ دھیسے لہجے میں کہتا گیا۔

تبھی ملازم نے فخر عالم کے فیملی ڈاکٹر کے پہنچ جانے کی اطلاع دی۔

دھنک چائے پی چکی تھی۔ آفس کو دیر ہو رہی تھی۔ اس نے اجازت چاہی۔

اور۔ ڈاکٹر ملازم کی ہمراہی میں اندر داخل ہو گیا۔

ڈاکٹر نے گولیوں کی بوتل اپنے قبضے میں لے لی۔ تاکہ مکمل جانچ کی جائے۔ گولیاں بہر حال وہ نہیں تھیں جو فخر عالم کو ہدایت کی گئی تھیں۔ بوتل پر دوئی کا نام کچھ اور تھا اور گولیاں کچھ اور۔

صحیح فیصلہ تو اس وقت دیا جاتا جب لیبارٹری میں گولیاں ٹسٹ کی جاتیں لیکن۔

یہ بات مکمل کر سامنے آگئی تھی کہ فخر عالم کی زندگی کو اصل گولیوں کی بجائے یہ گولیاں

کھلا کر نقصان پہنچانا بہر حال مقصود تھا!

ڈاکٹر بھی خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ فخر عالم کیساتھ چائے کا ایک کپ پی کر وہ بھی رخصت

ہو گیا۔

فخر عالم اٹھا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ تیار ہوا اور باہر لان میں آ گیا۔

تھوڑی دیر وہ یوں ہی بلا مقصد سائڈ واکس پر چلتا رہا۔ بھیننی بھیننی خوشبو بکھیرتے موٹی

پھول بہت دلکش لگ رہے تھے۔ کوبالٹ بلوشگاف آسمان پر تیرتا سفید بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا

بہت بھلا لگ رہا تھا۔ گلابی جاڑے کی نرم و گداز دھوپ جسموں کو حرارت بخش رہی تھی۔

اسے اچانک ہی یہ سب نیند کا ایک جھونکا لگا۔ جیسے فخر عالم کوئی خواب تھا، پہنا تھا اور وہ جاگ گئی تھی۔ خواب بکھر گئے تھے اور سنے ٹوٹ گئے تھے!

وہ شادی شدہ تھا۔ اس کے گھریلو مسائل بہت وسیع تھے، تازہ سے بہت الجھے ہوئے! اسے ان وسیع گیموں میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ ان معاملات سے دور رہنا چاہیے تھا۔ کوئی بھی خیر خواہ اسے یہی مشورہ دیتا۔

وہ اس دن کو کوٹنے لگی جس دن وہ اسکا انٹرویو لینے گھر سے نکلی تھی۔ انکل اشفاق کے منع کرنے کے باوجود آصف کی مرضی کے خلاف!
اور پھر۔۔۔ اچانک اسکا دل چاہا یہاں سے دور چلی جائے۔ سب چھوڑ چھاڑ کر، سارے بندھن توڑ کر!

کہ اسکا سر پھٹا جا رہا تھا۔ وجود نڈھال ہو رہا تھا۔
پھر یکدم ہی اسے خیال آیا۔

کیوں نہ انکل اشفاق سے کہہ کر لمبی چھٹی لے لے؟ گھر جا کر اپنے والدین اور بہنوں میں اطمینان سے چند دن رہے۔ اپنے تھکے ذہن کو سکون مہیا کرے!
واقعی۔۔۔ یہی ٹھیک تھا۔ نہ فخر عالم ہوتا، نہ اسکا شہر، نہ اس سے ڈبھیز کا خدشہ!
اور پھر۔۔۔ اچانک ہی اسے لے لے فاصلے نظر آئے اپنے اور فخر عالم کے درمیان۔ ناقابل عبور دوریاں در آتی نظر آئیں اپنے اور اسکے بیچ!
گھر میں کچھ تو سکون میسر آتا!

یہی سوچ کر وہ۔۔۔ اٹھ کر کچن میں چلی گئی شام کی چائے بنانے۔ فرزانہ سو رہی تھی۔ آج وہ ہی چائے بنا کر اسے پلاتی تو اچھا تھا۔
اسکے سر پر کا گراں بار بھی کچھ کم ہونے لگا۔ لڑکھڑاتا وجود اپنے بس میں آنے لگا۔
چائے بناتے بناتے اس نے فیصلہ پختہ کر لیا۔
فرزانہ کیساتھ چائے پیتے ہوئے وہ خاصا ہلکا محسوس کر رہی تھی۔

آفس کی ہماہمی میں دھنک نے صبح تک کی ہر بات پس پشت ڈال دی۔ آج خاصا کام تھا دفتر میں۔ اور اسے کچھ دن سے دی ہوئی اسائنمنٹ کی تکمیل پر چیف رپورٹرنے خاص طور سے زور دیا تھا۔ آج اسے بہر حال مکمل ہو جانا چاہیے تھا۔ اسی میں لگی رہی سارا وقت۔ آخر دوپہر تک کام ہو ہی گیا۔ ایک نظر ثانی ڈال کر اس نے اسائنمنٹ چیف رپورٹرنے کے حوالے کی۔
اور۔۔۔ گھر چلی آئی۔

کھانا کھا کر جو بستر میں آرام کرنے کی غرض سے لیٹی۔ تو ذہن فخر عالم کی طرف پلٹا۔ فخر عالم کے ذاتی مسائل کی طرف منتقل ہوا اور۔۔۔

وہ تھک سی گئی۔ نڈھال۔ اور پھر جیسے قدم لڑکھڑانے لگے۔
فخر عالم کو پانا۔ بہت بڑا آرتھ۔ سننے میں بڑا دلکش، دیکھنے میں بہت خوبصورت پر۔
عملاً بہت مشکل، بلکہ ناممکن سا لگ رہا تھا۔
فخر عالم کا نکاح ہو چکا تھا۔ اسکی منکوحہ بسا اوقات اسکے پاس آتی جاتی قیام کرتی۔ رخصتی کا کیا تھا، محض ایک دکھاوا؟ اب کیا فخر عالم اس سے چھٹکارا حاصل کرتا؟ اور فخر عالم فریاد کیوں اسے چھوڑتی؟ پھر کیا کورٹ پھریاں؟ نہیں۔۔۔

دھنک کو یہ سب بے حد مشکل لگا۔ اور پھر فخر عالم کا فریاد سے نفرت کرنے میں کچھ ہاتھ دھنک کا بھی تھا۔ فخر عالم اس سے نہ ملتا تو شاید وہ فریاد کو چھوڑنے کا بھی نہ سوچتا۔ اسے اور بھی برا لگا۔ اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا۔

وہ۔۔۔ الجھ الجھ گئی۔ جیسے اچانک اس کے ارد گرد جال بن دیئے گئے تھے۔ اور وہ ان میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ جیسے یکدم ہی کہیں بھول بھلیوں میں کھو کر اپنا راستہ بھول گئی تھی۔

READING
Section

فخر عالم ہر صبح اسکا انتظار کرتا۔ عادت جو ڈال دی تھی دھنک نے۔ تیسرے دن مجبوراً اس نے اسکے آفس فون کیا۔ پتہ چلا چھٹی پر گئی تھی۔ اور وہ بھی مہینہ بھر کی۔ اسے سخت حیرانگی ہوئی۔ اچانک اسے چھٹی کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی اور اگر اتنی ایمر جنسی تھی بھی تو اسے کسی طریقے سے بتا کر یا پیغام چھوڑ کر تو جاسکتی تھی۔ دن گزرنے لگے۔ فخر عالم آجکل ویسے بھی بہت مصروف تھا۔ ساتھ میں پریشان بھی۔ بزنس کا بھاری بھر کم بوجھ اوپر سے فریڈہ کی جھک جھک۔ بحث مباحثے! ایسے میں اسے دھنک کی ضرورت محسوس ہوتی، اسکی تسلی کی مگر۔ وہ تو اسے عین منجھدار میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ ڈائری جس میں اسکا پتہ درج تھا وہ بھی کہیں مل نہیں رہی تھی۔

آج اس سے مزید مہربانہ ہو سکا۔ اسکے آفس فون کیا۔ خوش قسمتی سے آصف نے ریسیو کیا اور اس سے وہ بڑی آسانی سے دھنک کے گھر کا ایڈریس اور فون نمبر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ خط لکھنے کا تو وہ شروع سے ہی چور تھا۔ فون کر دیا اس نے۔ ”کچھ بتائے بغیر ہی چلی گئیں کیوں؟“ اس نے چھوٹے ہی کہا۔ ”میں نے ضروری نہیں سمجھا۔“ وہ روکھے سے لہجے میں بولی۔ اور۔۔۔ فخر عالم چند سیکنڈز ریسیو کو دیکھتا رہا۔ ”تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔“ ”آپ میرا انتظار کرنا چھوڑ دیں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”کیوں؟“ وہ بے حد حیرت سے بولا۔

دونوں بعد وہ فرزانہ کیساتھ ڈاکٹر ماریا کے فلیٹ میں گئی۔ دیر تک تینوں گپ شپ کرتی رہیں۔ وہاں سے نکلیں تو دونوں ڈنر کیلئے قریبی ریستورنٹ میں گئیں۔ سوپ پیا، برگر کھائے۔ اس وقت وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

رات سونے کیلئے بستر پر لیٹی تو فوراً نیند آگئی۔ فخر عالم کے باپ کو زبردیگر مارا گیا تھا، سمیٹہ کو قتل کیا گیا تھا، فخر عالم نے رات سوتے وقت وہی گولیاں کھالی تھیں اور صبح بستر میں مرا ہوا پایا گیا۔ تینوں کی لاشیں ایک کمرے میں ایک ہی قطار میں رکھی تھیں۔

خوف کے مارے وہ پسینے میں تر پڑی اور فخر عالم کو دیکھ کر بہائے آنسوؤں سے تکیا اب بھی گیلا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ کتنا بھیانک خواب دیکھا تھا اس نے!

اٹھ کر وہ باتھ روم گئی۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ اور اپنے لئے سکون کی دعا مانگی۔ چھٹی کا ارادہ پختہ کیا۔ گھر جانے کا فیصلہ پکا کر لیا۔

سکون و اطمینان اسے امی ابو بہنوں اور گھر کے ماحول میں ہی مل سکتے تھے۔ ایک پل کو فخر عالم کا بھی خیال آیا۔ ایسے مشکل وقت میں وہ اسے چھوڑ کر جا رہی تھی، اسے اپنا آپ خود غرض بھی لگا مگر۔

یہ سب بھی تو اسکی برداشت سے باہر تھا۔

وہ سامنا نہیں کر سکتی تھی اتنے سارے مسائل کا!

اسکا نکاح نہ ہوا ہوتا تب بات اور تھی۔ تب وہ کسی بھی مشکل کا مقابلہ کر سکتی تھی۔

مگر اب۔۔۔ اسے اپنا آپ خود غرض بھی لگتا تھا۔ کسی اور لڑکی کی ملکیت کا انتظار کرنا کہ

کب وہ فارغ ہو اور اپنائے اسے۔

اسکی قسمت کہیں اور لکھی ہوگی۔ پہنچ جائے گی خود بخود وہاں ورنہ۔۔۔ شادی کو اس نے کبھی اتنا اہم تصور ہی نہیں کیا تھا۔ اسے اپنے پروفیشن سے ہر چیز سے زیادہ محبت تھی۔

آج ہی اس نے چھٹی کی درخواست دی۔ اور دو پہر دو بجے کھانا کھاتے ہی فرزانہ کو الوداع کہتی گھر جانے کیلئے بس میں بیٹھ کر روانہ ہوئی۔

اسکا بجا بجا چہرہ، شریقی آنکھوں میں اتری دیر اپناں۔ اسکے دکھ اور درد کی نماز تھی۔

امی نے اکثر پوچھا بھی مگر وہ ٹال گئی۔ کیا کہتی؟

آج تو اسی حد سے بڑھ گئی تھی، دکھ بے پایاں اور درد سوا ہو چلا تھا۔ جانے کیوں صبح ہی سے رونا رونا آ رہا تھا۔

تسلیم اور نلیم کالج گئی تھیں، امی پڑوس میں۔ وہ اکیلا بیرونی لان میں دھوپ میں چہرے پر بیٹھی سڈنی شیڈن کی 'Blood Line' کے اوراق پلٹ رہی تھی۔

درختوں کی لچیلی شاخوں پر بنی کوئٹس پھوٹ آئی تھیں۔ 'Kiss Me Quick' کے کانٹے دار شاخوں میں ننھے ننھے ہرے ہرے پتے نکل آئے تھے اور۔ اسکے بیڈروم کی

کھڑکی کے قریب لگی رات کی رانی پھولوں سے لد گئی تھی۔

تجھی گیٹ پر کی کال بیل بج اٹھی۔

رخ موڑتے ہوئے اس نے دیکھا۔

فریدہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہی ٹھاٹ باٹ، وہی طمطراق لئے!

متحیر سی کتاب بند کرتے ہوئے وہ پاس چلی آئی کہ۔ آخر تو وہ اسکے گھر آئی تھی!

"ہیلو"۔ دھنک ہو لے سے بولی۔

"ہیلو"۔ وہ جیسے کاٹ کھانے کو تھی۔

دھنک دھیرے سے مسکرا دی۔

"آئیے بیٹھیے"۔ دھنک نے لان میں رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں بیٹھنے نہیں آئی"۔ وہ تیزی سے بولی۔

"پلیز! اتنی دور سے چل کر آئی ہیں... "وہ اپنا فرض نبھار رہی تھی۔

"میں چل کر نہیں آئی گاڑی میں آئی ہوں"۔

"اوہ۔ پھر بھی بیٹھیے تو سہی"۔ اس نے اپنی مسکراہٹ دبالی۔

"بھولی مت بنو سمجھیں"۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے غصے سے بولی۔

"آئینہ فون مت کریں"۔ ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا کہ۔

وہ سختی نہ برتی تو وہ گھبرایا آسکتا تھا اور۔ کس دل سے اس نے اتنی سختی برتی کچھ اسے ہی معلوم تھا۔

فخر عالم کو پہلے تو یقین نہیں آیا۔ مگر۔ ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو غصہ آ گیا۔ اتنا کہ وہ سامنے اسے ہوتی تو اسے جھنجھلا ڈالتا۔

اسکے بعد۔ وہ پھر سے اپنی مصروفیات میں جت گیا۔ وہ فارغ تھوڑی ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے مارا مارا پھرتا۔ یہ تو اسکی دھنک سے بے پناہ محبت تھی جو وہ اس کیلئے روزانہ اور ضرور وقت نکالتا۔ بہر حال۔

وہ پریشان ضرور تھا۔ اس بے رخی کی وجہ اسکی سمجھ سے باہر تھی۔

دو چار روز اور بھی خاموش رہا۔ اپنے اوپر قابو پائے رکھا لیکن۔

آج پھر۔ جیسے پیار نے دل پر دستک دی۔

اس نے اسے خط لکھ ڈالا۔ وجہ پوچھی، اپنی بے قراری لکھی اور جواب کا منتظر رہا۔ لیکن۔

اس طرف سے ہفتہ دس دن گزر جانے کے بعد بھی جواب نہ آیا۔ اسکا مطلب تھا وہ اسے جواب کے قابل بھی نہیں سمجھتی تھی۔ تب وہ۔ جھنجھلا اٹھا!

اپ سیٹ رہنے لگا۔ بات بے بات نوکروں پر برس پڑتا۔ بلا وجہ آفس میں ڈانٹ ڈپٹ کرتا۔

دھنک کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ چڑچڑی رہنے لگی۔ بات بات پر بگڑ جاتی، بے اختیار رونے لگتی۔

فخر عالم کو بھول جانا کتنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بے بس ہونے لگتی، بے قابو ہو جاتی۔ اکیلے میں اکثر رو پڑتی۔ اسی طرح ہی کچھ دل کی بھڑاس نکل جاتی۔

کچھ روز اور گزر گئے۔ بڑی مشکل سے دل کو سمجھایا تھا، اپنے پیار کو تھپک تھپک کر سلایا تھا۔

”میں آپکا مطلب نہیں سمجھی“۔ وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”بننے کی ضرورت نہیں۔ فخر عالم سے آج ہی دستبردار ہو جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

وہ دھیرے سے ہنس دی۔

”تمہارے ساتھ اسکے نکاح کا سنتے ہی میں نے اسے خیر باد کہہ دیا ہے۔ مجھے بھی

دوسرے کے حصے پر قبضہ کرنا اچھا نہیں لگتا۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ اسکا میک اپ سے لٹا پتا چہرہ مزید تھمتھا اٹھا۔

”مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں اور تابی میں تمہارے غصے سے مرعوب ہوں۔“

دھنک کے لہجے میں بھی تیزی آگئی۔

”تم ہمارے درمیان نہ آئیں تو کبھی کی ہماری شادی ہو چکی ہوتی۔“ غصے سے اسکی

سانس تیز چل رہی تھی۔ ”تم اسکی دولت کے پیچھے ہو۔“ وہ مزید بولی۔

اور۔ دھنک سے اپنی توہین برداشت نہ ہو سکی۔

آگے بڑھ کر گیٹ کا پٹ وا کر دیا۔

”یہ راستہ باہر کو جاتا ہے۔ جن قدموں سے آئی ہو انہیں سے لوٹ جاؤ۔“

ایک پل کو فریاد جیسے سکتے میں آگئی۔ اس سے قبل شاید اس نے ایسے الفاظ نہیں سنے

تھے۔ لیکن۔

دوسرے ہی لمحے خود کو سنبھالا۔

”چلتی ہوں۔ لیکن اچھی طرح سن لو جلدی ہماری شادی ہونیوالی ہے۔ اسلئے آئندہ

تمہیں اسکے ساتھ کوئی رابطہ رکھتے دیکھا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔“ دھنکی آمیز لہجے میں کہتے کہتے

وہ باہر نکل گئی۔

دھنک نے گیٹ بند کیا۔ اور تھکی تھکائی سی آکر آرٹھ چہرہ پر ڈھیر ہو گئی۔

”جلدی ہماری شادی ہونیوالی ہے۔“ پگھلے سیسے کی طرح یہ فقرہ اسکے کانوں میں ریچنے

لگا تھا۔

شاید دھنک کے آجانے کے بعد دونوں کے حالات سلجھ گئے تھے۔ شاید وہ دوواکی زہر ملی

نہیں نکلی تھی اور دھنک سے مایوس ہو جانے کے بعد کہہ سن کر دونوں رخصتی پر آمادہ ہو گئے

تھے۔ ماؤف ذہن لئے وہ کرسی پر پڑی رہی۔

اور۔ آج ہی شام ایک بار پھر فخر عالم کا فون آ گیا۔

”مجھے صاف صاف بتا دو تمہارے کیا ارادے ہیں؟“

اوہ۔ تو وہ بھی آخری فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ مختصر ابولی۔

”مجھ سے تعلق نہیں رکھنا چاہتے ہیں؟“

رخصتی سے پہلے جیسے وہ آخری اور رکی باتیں کر رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا تھا بعد میں مجھے الزام

مت دینا۔

”یہی سمجھ لیں۔“

”کوئی خاص بات ہوئی ہے؟“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”بس۔ دل نہیں چاہتا۔“

”اوہ۔“ ساتھ ہی ریسیور کریڈل پر رکھنے کی آواز آئی۔

کمرے میں آکر بستر میں گھس کر وہ دیر تک چپکے چپکے روتی رہی۔

کاش! وہ اس نے کبھی نہ ملی ہوتی۔ کاش اسے اس کی شادی کا پتہ ہی نہ چلتا اور کاش! وہ

آج آخری اور رکی باتیں نہ کرتا!

”کوئی نئی خبر سناؤ یہ تو پرانی ہو چکی ہوگی“۔ وہ بڑے ضبط سے بولی۔

”نئی خبر؟“

”ہاں“۔

”اچھا سوچتا ہوں۔ ہاں“۔ وہ بے اختیار ہنس دیا۔ ”وہ جو ہم گداگروں پر آرٹیکل لکھ رہے تھے نا... دو چار روز پہلے میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ کسی نے اچانک کمر میں زور سے بیساکھی ماری۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی ادھیڑ عمر فقیر تھا جو انٹرویو کے دوران بھی بہت بڑھ بڑھ کر بولتا تھا۔ کہنے لگا کہیں اکیسے ٹلوگے یا نہیں سیدھا کر دوں گا...“

آصف کیساتھ ساتھ دھنک بھی ہنس دی۔

”اسی طرح ہنستی رہا کرو۔ کیا منہ لڑکائے بیٹھی تھیں صبح سے“۔

وہ پھر ہنس دی۔

”ویسے آصف تمہیں واقعی احتیاط کرنا چاہیے۔ ان سے کچھ بعید نہیں“۔

”ایسی کی تیسری کر دوں گا ہونہ۔ ویسے مادام جرنلسٹ! ایک جرنلسٹ کو مضبوط اور مستحکم ہونا چاہیے۔ لہجے میں مضبوطی اور استحکام ہونا چاہیے۔ بلکہ بعض اوقات ضرورت پڑنے پر کراخت ہونا چاہیے۔ کیا تمہارا خیال ہے لوگ ہمیں ڈرائیں دھمکائیں اور ہم مرعوب ہو جائیں۔ سچ لکھنا چھوڑ دیں۔ جھوٹ، لوٹ کھسوٹ اور کرپشن کی نشاندہی کرنا چھوڑ دیں۔ رشوت لینا شروع کر دیں ضمیر بیچ دیں اپنا۔ میں تو...“

”بس بس دم لیس ذرا مسٹر آصف“۔ وہ دل ہی دل میں اسکی معترف ہو رہی تھی۔

”میں تو چاہے جان جائے سچ لکھوں گا۔ جھوٹ کو بے نقاب کروں گا...“

”بھئی میں تو اس گداگر کی بات کر رہی تھی“۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہنسی آگئی۔ ”جو تم

پر بات بات پر طنز کر رہا تھا۔ تمہیں اپنے ساتھ بھیک مانگنے کی بھی دعوت دی تھی...“

”اسی نے تو اس دن بیساکھی ماری تھی“۔ وہ بھی ہنس دیا۔

”تخنکے کو کمزور مت سمجھو آنکھ میں پڑ جائیگا“۔

پورے ایک مہینے بعد آج وہ میگزین کے آفس آئی تھی۔ بقول آصف بالکل بدلی ہوئی تھی۔ جیسے وہ دھنک کہیں کھو گئی تھی، گم ہو گئی تھی۔ یہ دھنک اور تھی، مختلف تھی بالکل۔

”اور ہاں سنو۔ سنا ہے تمہارے اس دشمن نے اپنی کزن سے شادی کر لی ہے“۔

اور۔۔۔ دھنک جیسے منوں وزن تلے دھنستی چلی گئی۔

”کب؟“ وہ بولی۔ کہ وہ نہیں چاہتی تھی آصف کچھ سمجھ جائے۔

”کچھ دن ہوئے سجاد بتا رہا تھا۔“ سجاد بھی ان کا کولیگ تھا۔ ”بلکہ مجھے تو تب اس نے بتایا تھا جب مسٹر فخر عالم سکیننگ پر گیا تھا۔ میں تمہیں بتانے لگا تھا کہ میری سکیم فیل ہو گئی وہ لڑکی مسٹر عالم کی کزن نکلی۔ مگر پھر تمہارا فون آ گیا اور میں بات بھول بھال گیا۔ ہاں تو سجاد کہتا تھا اس نے اپنی کزن سے سنا ہے۔ سجاد کی کزن اور مسٹر عالم کی کزن کی آپس میں کچھ جان پہچان ہے۔ مسٹر عالم کی کزن کا نام فریدہ ہے۔ اسی نے اسے بتایا ہے کہ ان دونوں کی شادی ہونوالی ہے۔ بہر حال اب تک ہو چکی ہوگی اس بات کو کچھ دن ہو گئے ہیں...“

تو۔۔۔ فریدہ سچ کہہ رہی تھی۔

اور... اور... فخر عالم نے بھی جیسے آخری اور رسمی سی گفتگو کر کے اپنا فرض پورا کر لیا تھا۔

دھنک اپنے آپکو سنبھالنے لگی۔ چہرے پر رونق لانے کی کوشش کرنے لگی۔

”تمہارے پاس ان خبروں کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے؟“ وہ بمشکل مسکرائی۔

”اور یہ کہ۔“ وہ ان سنی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مسٹر عالم کی کزن کہتی تھی کہ ان دونوں

کے درمیان ایک لڑکی آگئی تھی مگر اب وہ درمیان میں سے نکل گئی ہے۔ اب راستہ صاف

ہے اور وہ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔“

مگر۔ اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا اسے بھول جانے کا۔
 پر۔ کیا وہ اسے بھول پائی تھی۔ ایک ہل کو بھی؟
 کیا ہوگا؟ کیا اسکی زندگی اسی درد میں کٹے گی؟ وہ ہلکے ہلکے کر رہی۔
 فخر عالم نے اس کیساتھ فلرٹ نہیں کیا تھا۔ وہ بے وفا نہیں تھا۔ خود وہ ہی اسے چھوڑ
 کر چلی آئی تھی۔ اب بھگتنا تو تھا ہی۔ وہ مزید رو دی۔
 فخر عالم اب کسی اور کا ہو چکا تھا۔ اور اس کیلئے محض ایک اجنبی تھا۔ وہ نیچے میں من
 دیکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تبھی فرزانہ آگئی۔
 ”کیا ہوا دھنک؟“ اس کے قریب بستر کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے وہ تشویش سے بولی۔
 ”کچھ نہیں۔“ وہ روتے روتے بمشکل بولی۔
 ”کسی نے آفس میں کچھ کہہ دیا ہے؟“
 ”نہیں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سرگھٹنوں پر رکھ لیا۔
 ”پھر کیا ہوا ہے بتاؤ نا؟“ اس نے اس کا جھکا سر اٹھایا۔
 رورو کر اسکی خوبصورت آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

”بس روؤ نہیں پلیز۔ آگے ہی گھر سے بجائے مہمند ہونے کے مرجھائی مرجھائی آئی ہو
 اوپر سے اس قدر رونا۔ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔ آفس میں یا پھر اس بکھیرے میں جس میں تم نے
 قدم رکھا تھا اور جس کیلئے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا... بہر حال چھوڑو
 جو ہوا سو ہوا۔ اپنے آپکو ہلکان مت کرو۔ تمہاری ضرورت اور بھی بہت سے لوگوں کو ہے...“
 فرزانہ کی باتیں سن سن کر دھنک اپنے حواسوں میں آنے لگی۔ انکھیوں کی پوروں سے
 آنسو پونچھے۔ پاؤں نیچے لٹکاتے ہوئے چپل پہنے اور اٹھ کر منہ دھونے باتھ روم جانے لگی۔
 ”چلو شاپاش کپڑے بدل لو۔ منہ ہاتھ دھولو۔ کھانا کھاتے ہیں پھر۔“ فرزانہ نے اسے
 باتھ روم تک جانے میں مدد دی۔

”واہ۔ واہ مگر ارشاد۔“
 ”سچ لکھو، مضبوط رہو۔ مگر احتیاط برتنے میں کیا حرج ہے۔“
 ”تم نے احتیاط برتی تھی؟ ایک قاتل کی تلاش میں یوں بے دھڑک اکیلی چل پڑی تھیں
 جیسے... پاکستانی نہیں کوئی ویسٹرن رپورٹر ہو۔ اور...“
 اچھا خدا حافظ۔ اور میں انکل اشفاق کے پاس جا رہی ہوں۔“ وہ اس بحث تک سے
 گھبرانے لگی تھی۔ اٹھ کر چیف ایڈیٹر کے دفتر کی طرف چل دی۔
 گھر آ کر وہ ادنیٰ بستر پر پڑ رہی۔

فخر عالم اس سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہو گیا تھا۔ دونوں کے راستے بالکل مخالف سمت
 نکل گئے تھے۔
 آنسوؤں کے درمیان وہ سوچتی رہی۔ کہیں اس کی طرف سے تو کوئی جھول نہیں رہ
 گیا تھا؟ پھر سوچتی اس نے تو اپنی طرف سے اچھا کیا تھا۔ فریڈہ جیسی بھی تھی، تھی تو عورت ہی۔
 اس کا حق وہ کیسی مارتی؟ ایک نکاح شدہ جوڑے کے درمیان وہ کیونکر آتی؟ اس کا ضمیر بھی تو
 گوارا نہیں کر رہا تھا۔ پھر۔ فخر عالم کے گھریلو حالات اس قدر الجھے ہوئے تھے، اس قدر پیچیدہ
 تھے کہ وہ گھبراہٹی تھی۔ نہیں ڈالنا چاہتی تھی ہاتھ ایسے معاملات میں۔ اور پھر۔ یہ بھی
 تو تھا کہ لوگ سمجھتے وہ اسکے دولت کے پیچھے تھی۔ یہی سب ل کر اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہے
 تھے۔

ہاں ایک پوائنٹ پر آ کر وہ خود کو ملامت سا محسوس کرتی کہ ایک ایسے لمحے میں وہ اسے
 چھوڑ کر چلی آئی کہ جس وقت وہ بہت تنہا تھا، بہت اکیلا تھا اور اسکی ضرورت محسوس کر رہا تھا!
 یہیں آ کر وہ خود کو اس کا گناہ سمجھتی۔ اسے اس کے پہلے فون کا خیال آتا۔
 ”تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔“
 ”آپ میرا انتظار کرنا چھوڑ دیں۔“ جواب میں کتنی بے حس سے بولی تھی وہ۔
 پھر اس کا خط۔ کتنی بے قراری تھی اس میں اس کیلئے۔

کے بعد تسلیم کو بھی ساتھ لیکر جانا تھا۔ لڑکا وہاں پر پڑھائی کے آخری مراحل میں تھا۔ خیال تھا تسلیم بھی یورپ گھوم آئیگی۔

خط پڑھ کر اسے خوشی ہوئی۔ پہلے امی ابوخواہ مخواہ ہر رشتہ اسکے انتظار میں واپس کر دیتے۔ اچھا کیا اب کے واپس نہیں کیا۔ اسکا نہ کسی تسلیم اور نہ تسلیم تو اپنے گھر کی ہو جاتیں۔ وہ تو پھر بھی اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔ اچھا کیا ہی تھی اور مطمئن تھی۔

دھنک کیساتھ ساتھ انہوں نے فرزانہ کو بھی آنے کی دعوت دی تھی۔ وقت کم اور کام زیادہ تھے۔ امی نے دونوں کو شادی سے دو چار روز قبل آنے کو لکھا تھا۔

فرزانہ آئی تو دھنک نے اسے امی کا خط دکھایا۔

بس پھر کیا تھا۔ دونوں ماری ماری شوپنگ میں لگ گئیں۔ مہندی، خستہ، ہولیمہ سبھی کیلئے تو ڈریسز تیار کرنے تھے۔ میچنگ شوز اور کیا کچھ نہیں۔

فرزانہ نے تو تسلیم کیلئے گفٹ بھی لینا تھا۔ گفٹ خرید کر وہ دونوں وہیں قریب ہی علاقے کے سب سے ڈسینٹ اور بڑی بک سٹال میں گھس گئیں۔ گفٹ پیک بھی کروانا تھا اور گفٹ پیکٹ کے اوپر کارڈ بھی لگانا تھا۔

فرزانہ کارڈ پسند کرنے لگی اور دھنک ادھر ادھر گھوم پھر کر ریکس میں لگی کتابوں پر نظریں دوڑانے لگی۔ اسے اچھی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

تبھی۔ وہ مخصوص مدھر پر فیوم کی مہک سے چونک اٹھی۔ غیر ارادی طور پر ارد گرد دیکھنے لگی۔ پاس ہی۔ اسکے بالکل پاس کھڑا ٹر عالم بھی کتابوں پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے رخ واپس پھیر لیا۔ آگے بڑھ آئی۔

کیا فخر عالم نے بھی اسے دیکھا تھا؟ کیا اس نے بھی اسکی موجودگی نوٹ کی تھی؟ مگر وہ یہ سب کیوں سوچ رہی تھی؟ اس نے شادی کر لی تھی اور دھنک نے پھلا ہر رشتہ توڑ دیا تھا۔ پھر وہ کیوں اس سے کوئی اور امید رکھتی تھی۔

وہ دکان سے باہر نکل کر فرزانہ کا انتظار کرنے لگی کہ اندر جیسے اسکا دم گھٹ رہا تھا۔ سانسیں

دن یوں ہی بے کیفی میں گزر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے پاگل من کو سمجھا پاتی تھی فخر عالم اسکے نہیں کسی اور کے نصیب میں تھا۔ وہ اپنے آپ کو رسالے اور دفتر کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ مصروف رکھتی۔ آصف سے باتوں میں وقت اچھا کٹ جاتا۔

پھر آج تو وہ ایک فشر کی بیوی کا انٹرویو لینے بھی گئی تھی۔ اسے بڑا مزہ آیا۔ فشر تو فشر بیوی ڈیڑھ فشر نکلی۔

”سنا ہے آپ بہت اچھا کھانا بنا لیتی ہیں۔“ اس نے واقعی کسی سے سن رکھا تھا۔

”جی نہیں۔ آپ نے بالکل غلط سنا ہے۔ میں نے کبھی اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں بنایا۔“ جواب ملا تھا۔

”فشر صاحب کافی بارعب شخصیت ہیں۔ آپکے ساتھ انکارویہ کیسا ہوتا ہے؟“ اس نے پھر سوال کیا تھا۔

”فشر ہونگے وہ پبلک کیلئے۔ گھر میں ان پر رعب ڈالتی ہوں۔“ بیگم فشر بولی تھیں۔

کافی دلچسپ انٹرویو تھا۔ آفس آکر اسے مکمل کیا۔ نیٹ کیا اور ایڈیٹر کے حوالے کر کے گھر آگئی۔

فلٹ کے آگے لگے بچن بوس پر ڈی کے خانے پر نظر پڑی۔ اس کے نام کا خط انکا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اچک لیا۔ امی کا تھا۔

اندرا آئی بیگ ایک طرف ڈالا، خط کھولا۔ باقی احوال کیساتھ یہ بھی خبر لکھی تھی کہ تسلیم کی اس ڈاکٹر کیلئے ہاں ہو گئی جو پہلے دھنک کیلئے آیا کرتے تھے۔ بہت اچھے لوگ تھے امی کافی مطمئن لگ رہی تھیں۔ نکاح کی رسم دو ہفتے بعد قرار پائی تھی۔ لڑکا لندن سے آنی والا تھا۔ نکاح

ٹرین کی رفتار کم ہوگئی۔ اور پھر آہستہ آہستہ ٹرین پر رک مچی۔ دونوں کیا دیکھتی ہیں کہ
آنٹی نور جہان بمعہ سوٹ کیس کے اندر تشریف لے آئیں۔

”آنٹی!“ دھنک خوشی سے اچھل پڑی۔

آنٹی جو اتنی مہربان اور دلچسپ شخصیت تھیں!

”ارے بیٹا تم۔“

”ہاں آنٹی۔ تسلیم کی شادی پر میں اور فرزانہ جا رہے ہیں۔ فرزانہ کو دھنک کے سب

ملنے والے اسکی مخلص دوست کے حوالے سے جانتے تھے۔

”ارے تو میں کہیں اور تھوڑی جا رہی ہوں۔ وہیں تو جا رہی ہوں۔ کب کا بلاوا آیا رکھا

ہے۔“

دھنک نے انکا سوٹ کیس اوپر اپنے سامان کیساتھ رکھ دیا۔ آنٹی بھی انہیں کیساتھ بیٹھ

گئیں۔

پھر تو جو گپ شپ شروع ہوئی مزا آ گیا۔

دو چار میل اور گزر گئے۔

اب چشیل میدان تھا۔ اس پر خورد و جھاڑیاں۔

دھنک کٹرکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ چشیل میدان اور خورد و جھاڑیوں کا اپنا حسن تھا۔

پھر۔۔۔ وہ چونکی۔ ساتھ چلتی سڑک پر جیپ میں فخر عالم جا رہا تھا۔ اس نے یقیناً اسے

دیکھا تھا۔ جیسی کبھی کبھار اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیتا مگر۔۔۔ پرکشش چہرہ بالکل ساٹ تھا

اور دلنشین آنکھیں کسی بھی جذبے سے عاری تھیں۔ وہ بہت قریب سے جا رہا تھا اور۔۔۔ اکیلا

تھا اس وقت۔ کسی کاروباری کام سے شاید جا رہا تھا اسی لئے فریدہ ساتھ نہیں تھی۔ بہر حال۔۔۔

دھنک نے رخ اندر کی طرف کر لیا۔ انگاروں پر جی راکھ کو پھونک مارنے سے فائدہ؟

جل ہی تو جانا تھا!

وہ کس طرف نکل گیا؟ ٹرین کس رخ جانگلی تھی؟ اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔

رک رہی تھیں۔

اس وقت پھر وہ گم سم لگ رہی تھی۔ فرزانہ نے بھی نوٹ کیا۔

”کیا ہوا دھنک؟“ گھر کی طرف آتے آتے فرزانہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ افسردہ سی مسکرا دی۔ ”تمہیں تو خواہ مخواہ وہم ہو گیا ہے۔ جہاں میں

ذرا خاموش ہوئی تم سمجھیں مجھے کچھ ہو گیا ہے۔“ اسکی آواز جیسے دور سے آرہی تھی۔

”تمہیں چپ دیکھ کر مجھے واقعی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ... وہ والی بات تو ختم ہوگئی نا؟“

اسکا اشارہ دھنک کے افسیر کی طرف تھا۔

”ہاں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”پوچھ سکتی ہوں کیوں ختم ہوا؟“

”اسلئے کہ اسکی شادی ہوگئی اور میں درمیان میں سے ہٹ آئی۔“ وہ بڑے ضبط سے بولی۔

”اچھا کیا۔ مٹی ڈالو اب اس بات پر۔ جو چیز باقی نہ رہی ہو اسکا رونا کیسا۔ چلو آؤ شوپنگ

کی چیزیں دیکھتے ہیں۔“ وہ اسکا دھیان بنانے کو مختلف چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

اور۔۔۔ یوں ہی کرتے کرتے دو ہفتے بھی گزرتے تو آگئے۔

وہ دونوں خوشی خوشی دھنک کے گھر کیلئے روانہ ہوئیں۔ اس بار انہوں نے ٹرین سے

جانے کا سوچا۔ جلدی جلدی ٹرین پہنچیں، ٹرین میں چڑھیں، مختصر سا سامان رکھا اور کٹرکی

کے قریب جگ لیکر بیٹھ گئیں۔

ٹرین چل پڑی۔ آبادی سے نکل کر اب وہ لہلہاتے کھیتوں اور گھنے درختوں میں سے

گزر رہی تھی۔ پھر سیاہ تاریک سرنگ آئی، قدرے چڑھائی شروع ہوئی، ساتھ ہی پائین کے

اکاد کا درخت، جھاڑیاں، لمبی لمبی گھاس۔ دور۔ بہت دور۔ اوپر۔۔۔ خوب اوپر پہاڑی سلسلے

پر چمچ اور صنوبر کے درخت برف سے ڈھکے نظر آ رہے تھے۔ ٹرین یہاں نیچے سے ہی آگے

بڑھ جاتی تھی۔ یہاں سے ہی دوبارہ میل اونچائی پر آنٹی نور جہان کا گھر تھا۔ ساتھ ہی فخر عالم

کا اسٹیٹ اور جنگلات!

فرزانہ نے ہی اسے چونکایا۔ آنٹی بھی جلدی جلدی اپنا سوٹ کیس اتارنے لگیں۔
دھنک نے گھر اطلاع کی ہوئی تھی۔ ڈرائیور گاڑی لیکر آچکا تھا۔ تینوں بیٹھ کر گھر آ گئیں۔

شادی میں بڑا سزا آیا۔ اسکا بہنوئی بہت اچھی طبیعت کا اور خاصا پینڈم تھا۔ ہر دستور پورا ہوا مگر جلدی اور سادگی سے انجام پایا۔ کیونکہ کمال نے ویسے کے اگلے ہی دن لنڈن کیلئے روانہ ہو جانا تھا۔ تسلیم حسب پروگرام ساتھ نہ جاسکی تھی کہ اسکے ابھی کاغذات تیار ہونے میں چند دن تھے۔ کاغذات تیار ہوتے ہی اس نے لنڈن کمال کے پاس پہنچ جانا تھا۔ دھنک اور فرزانہ کی بھی صرف چار دن کی چھٹی تھی سو وہ دونوں اور آنٹی نور جہان بھی ویسے کے فوراً بعد پھر سے ٹرین میں چل پڑیں۔

فرزانہ اور آنٹی نور جہان کی موجودگی میں سفر بہت اچھا کٹ رہا تھا۔ گپ شب میں وقت کا پتہ نہیں چل رہا تھا اور پھر آج تو رات بھی اس نے اور فرزانہ نے آنٹی کے بہت اصرار پر ان کے یہاں گزارنی تھی۔

ٹرین اپنی مخصوص چال اور رفتار سے چلی جا رہی تھی۔

چهار سورات کی سیاہیاں اتر آئی تھیں۔ ٹرین میں بتیاں جل رہی تھیں اور — ڈنر کی کراکری اور کٹلری کھنگ رہی تھی۔

آٹھ بج چکے تھے۔ انہوں نے بھی کھانا منگوا یا۔ چٹ پٹا، لہ پٹا، میزنگ۔

تینوں دلچسپ باتوں کے دوران لذیذ کھانے سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔

ٹرین رواں دواں تھی۔ پسجرز تھکے تھکے!

دھنک اور فرزانہ نے دیکھا۔ سیٹ کی پشت سے سر نکالے ککائے آنٹی کو غنودگی نے آلیا تھا۔

”دھنک“ فرزانہ نے دھیرے سے اسے مخاطب کیا۔

”ہوں“۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

پتہ نہیں کیوں؟ کوئی اسکی شادی کا ذکر بھیڑتا تو اسے محسوس پھر کر فخر عالم کی یاد آ جاتی۔ کہ وہ اب تک اسے بھولی نہیں تھی کہ یہ اسکے بس میں نہ تھا مگر اسکی یادوں کو وقت کی راکھ تلے دبانے کی کوشش ضرور کی تھی۔

رات قریباً گیارہ بجے وہ لوگ آئی نور جہاں کے ہمراہ ٹرین سے اتر گئیں۔ ٹیکسیاں تیار کھڑی تھیں۔ ایک میں بیٹھ کر وہ لوگ بھی گھر کو چل پڑیں۔

سخت سردی تھی یہاں۔ برف اب بھی جگہ جگہ نظر آ رہی تھی۔ جبکہ اندھیرے میں بھی پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

نظریں ہینٹکتیں آئی کے مشرقی پڑوس پر ٹھہر گئیں۔ آسمان کو چھوٹے بلند وبالا چیز و صنوبر کے درخت، برف، بادل، کہر سب مل کر قدرت کی عظمت کو اجاگر کر رہے تھے۔ جا بجا فوگ لائینس اس وقت بھی روشن تھیں۔ شاید آئی کا مشرقی پڑوسی آج ادھر ہی تھا۔

ہزار کوششوں سے سنبھالا دل اس وقت پھر اٹھل پٹھل ہونے لگا۔ یہاں اس نے چند بہت خوبصورت اور یادگار دن گزارے تھے۔

اسے کئی باتیں یاد آئیں۔ فخر عالم اس ڈاکٹر سے جس سے اسکا علاج ہو رہا تھا جلتا سا تھا۔ اپنے دوست کامران کا دھنک سے فری ہونا سے اچھا نہیں لگا تھا۔ کسی طرح چاہتا تھا کہ وہ رک جائے مگر روکنے کا کوئی جواز نہ ملتا تھا۔ کئی باتیں ایسی تھیں جو بن کے محسوس کی جاسکتی تھیں۔

”چلو نا اندر۔ برف کی طرح تم بھی جم جانا چاہتی ہو کیا۔“ فرزانہ تھی۔

”چلو۔“ وہ اندر کی طرف بڑھی۔

رات گزار کر وہ اور فرزانہ دوبارہ ٹرین میں سوار ہو گئیں۔ اگرچہ دل دونوں کا واپس جانے کو نہیں کر رہا تھا۔ یہ جگہ ہی اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ جی چاہتا تھا وہ جاؤ یہاں، بس جاؤ یہاں۔ کبھی واپس نہ جانے کیلئے!

”خود سے سنو۔ آئی نے مجھے خاص طور سے تمہیں سمجھانے اور اس بات پر Convince کرنے کو کہا ہے۔“

”کس بات پر؟“ رخ موز کر وہ فرزانہ کو دیکھنے لگی۔

”ایک لڑکے کامران کا تمہارے لئے رشتہ آیا ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کسی دوست کے گھر دیکھا تھا۔ شاید تم نے بھی دیکھا ہو۔ بہر حال ہر لحاظ سے موزوں ہے۔ جاب، فیملی، کریئر سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ اب انکار مت کرنا۔ آئی کہتی تھیں چھوٹی بہنیں بیانی جاری ہیں اور یہ بات ہی نہیں سنتی۔ وہ چاہتی ہیں انکی زندگی میں ہی تم سب اپنے اپنے گھروں کی ہو جاؤ۔ تمہاری جاب انیس ایک آنکھ نہیں بھاتی...“

دھنک کو بہت کچھ یاد آیا۔ کتنی باتیں، کتنے واقعے، کتنے حادثے... فخر عالم کے یہاں قیام کے دوران...!

”سن رہی ہونا؟“ اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر فرزانہ پھر بولی۔

”آں... ہاں۔“

”اچھی طرح سوچ لو اس بات پر۔ اور پلیز نامت کرنا۔ مجھ سے آئی نے جلدی جواب مانگا ہے۔“

کامران کو اسکا خیال کیسے آگیا؟ لابی سی چیز تھا۔ بہر حال۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ فرزانہ نے پھر کہا۔

وہ ہنس دی۔

”بھئی تو تم ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات کر رہی ہو۔ سوچنے تو دو نا۔“ وہ فرزانہ کی خاطر بولی۔ ورنہ اسے شادی کے ذکر سے ہی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

”جلدی سوچ لو۔ جواب جلدی دینا۔“

”اچھا بابا۔“

اور وہ پھر سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

منزلیں جدا ہو گئی تھیں۔

موٹر بائیک ایک طرف پارک کر کے دھنک کیساتھ آصف بھی بک سٹال میں داخل ہو گیا۔
بڑے سے بک سٹال میں دھنک کارڈز پر اور آصف یون ہی کتابوں پر سرسری نظریں
دوڑا رہا تھا۔

آصف نے اپنے برتھ شارک کینج خرید اور بچوں کی طرح خوش خوش دھنک کے پاس پہنچا۔
”پلیز! یہ یہاں لگا دو نا!“ اس نے اپنی جیکٹ کے بائیں طرف اشارہ کیا۔
”اوہ۔ Scorpio“ وہ اس کینج دیکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔
”کیوں؟“

”یقین کرو مجھے بچھو کی تصویر سے بھی نفرت ہے۔“ وہ بری سی شکل بنائے کھڑی تھی۔
”کم آن دھنک۔ لگا دو پلیز!“
”کوئی اچھا شار لیکر نہیں آسکتے تھے۔“ وہ مسکراتے ہوئے اسکے ہاتھ سے بیج لیکر بہت
احتیاط سے اس کی جیکٹ پر لگانے لگی۔

جیسے ذرا بے احتیاطی ہوئی اور پچھونے ڈنگ مار دیا۔
”اتنا ڈر پوک تو میں تمہیں نہیں سمجھتا تھا۔“ آصف ہنس دیا۔
”ڈر پوک نہیں... مجھے... ڈر لگتا ہے۔“ وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔
”ایکسکیوز می۔“ فخر عالم تھا۔ موسم کے لحاظ سے بہترین سوٹ زیب تن کئے گزرنے
کیلئے دھنک سے راستہ مانگ رہا تھا۔ مگر۔
جیسے کاٹ کھانے کو تھا!
اسکی کسی قسم کی پابند نہ ہوتے ہوئے بھی دھنک یکدم محتاط سی ہو گئی۔ پھر ایک طرف ہٹ
کر اسے راستہ دیا۔

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ مسٹر عالم ہواؤں سے کیوں لڑتا پھرتا ہے؟“ آصف اسی خوشگوار سے

بولتا۔

اب پھر وہی ڈیوٹی تھی۔ وہی دھنک کا آفس اور فرزند کا کالج۔ گردش صبح و شام!
آج چھٹی پر آفس سے وہ آصف کیساتھ موٹر بائیک پر بیٹھ گئی۔ نیلم کی برتھ ڈے آنیوالی
تھی اس نے اس کیلئے برتھ ڈے کارڈ خریدنا تھا۔
دونوں باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔

معا۔ پیچھے ہارن ہوا۔

دھنک نے چونکتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔

فخر عالم کا ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا اور فخر عالم پیچھے بیٹھا نہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ اس لمحے
بھر میں ہی اس نے نوٹ کیا۔ فخر عالم کے پرکشش چہرے کے نقوش تاؤ کی زد میں تھے۔ اور
سیاہ چمکتی آنکھیں جیسے باوجود کوشش ضبط کے غصہ غصہ سی تھیں۔

دھنک سے نظریں چار ہوتے ہی اس نے نگاہیں سامنے جمادیں۔

جانے کیوں؟ دھنک کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔ اسے اب بھی دھنک کا خیال تھا!
مگر پھر۔۔۔ تنگی سے مسکرا دی۔

اسے اب بھی دھنک کا خیال تھا۔ وہ کب کہتی تھی کہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اسے
چاہتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اسکی شادی ہو گئی تھی اور اب اسے محتاط رہنا چاہیے تھا جسکی۔ شاید
وہ کوشش بھی کر رہا تھا۔ جیسی تو اپنے جذبات چھپانے کی خاطر سامنے دیکھنے لگا تھا۔
اسے شاید آج پھر اسکا آصف کیساتھ بائیک پر بیٹھنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اسکی ناراضگی پر وہ
واقعی اسکے بعد آصف کیساتھ نہیں بیٹھی تھی مگر۔

اس نے گہری سانس لی۔ اب وہ بھی اسکی پابند نہ رہی تھی۔ دونوں کے راستے الگ

”پتہ نہیں“۔ دھنک نے خوبصورتی سے کندھے اچکائے۔

”کارڈ خرید لیا؟“

”ہاں۔ چلو۔“ بیج لگا کر وہ چلنے کو تیار ہوئی۔

اور۔۔ دونوں باہر آ کر دو بارہ بائیک پر بیٹھ گئے۔

دھنک دنوں بعد خوش خوش چپک رہی تھی پر۔

فلٹ کی سیرھیاں چڑھنے لگی تو احساس ہوا۔

وہ تو کسی اور کا تھا۔ وہ کیوں خوش ہو رہی تھی؟

صرف یہ ہی تو کافی نہیں تھا کہ فخر عالم کو شاید اب بھی اس کا خیال تھا، پروا تھی۔ اسکی شادی اسکی

بیوی ایک مسلم حقیقت تھی۔ اور وقت کیساتھ ساتھ اس نے دھنک کو بہر حال بھول جانا تھا۔

اور۔۔ اور۔۔ بعد میں شاید وہ اپنے اسی پیار کو یاد کر کے فریدہ ہی کے ساتھ مل کر اپنے اوپر

ہنستا، اپنی بیوقوفی سمجھتا!

گہری سانس لیتی وہ تھکی تھکی سی فلٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

آج گل داؤدی کی سالانہ نمائش شروع ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً ہر سال یہ نمائش دیکھنے

جایا کرتی تھی۔ سفید، گلابی، کاسنی، زرد، سنہری تقریباً سبھی رنگوں میں سب ایک ہی قطار

در قطار۔۔ جیسے گل داؤدی کی بہار آگئی ہو۔ پھر سفید پھول تو اتنے بھلے لگتے کہ وہ کتنی کتنی دیر

کھڑی آنکھوں کی پیاس بجھاتی رہتی۔

فرزانہ کو بھی اس نے تیار رہنے کو کہا تھا۔ آفس میں بس حاضری دینے جانا تھا۔ اور پھر

سیدھے Exhibition پر۔

”فرزانہ تم تیار ہو؟“ دس بجے کے قریب فلٹ پر آتے ہی اس نے جلدی مجاوی۔

”ہاں۔ بس یہ دوپٹہ استری کر لوں۔“

”جلدی کرو۔ کوئی ٹیک...“

ایگزپیشن کے پہلے دن کی بات ہی کچھ اور ہوتی تھی۔ پرائز کس کے پھولوں کو ملا؟ مجھ

کون کون تھے؟ سب پتہ چل جاتا تھا۔ اور پھر پھولوں کی تازگی بھی تو دیدنی ہوتی تھی!

دھنک بھی جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔ ڈارک گرین کپڑوں پر گرے جیکٹ اور گرے

ہی شوز پہنے۔ کھنے خوبصورت بالوں میں برش کیا اور۔۔

کندھے سے اپنا ونڈ بیگ لٹکاتی وہ تیار کھڑی تھی۔

”آصف بھی آئے گا۔“ دھنک نے اطلاع کا کہا۔

”وہ تمہارا کونسا لڑکا ہے؟“ فرزانہ جو تے پہنتے ہوئے

ہولی۔

”ہاں۔ فرزانہ کو انی اسکی ہوگی تمہاری۔“

READING
Section

”نو۔ نو۔ بہہ۔“ جھنجھلا جھنجھلا کر کہتے ہوئے اس نے سر جھٹکا۔

جانے کیا کہنا چاہتا تھا وہ؟ بہر حال غصہ غصہ سا دوسری طرف نکل گیا۔

دھنک نے نظروں ہی نظروں میں ادھر ادھر فرزانہ کو ڈھونڈا۔ دور پر لی طرف سنہری رنگ کے پھولوں کے پاس کھڑی کسی لڑکی سے باتوں میں مصروف تھی۔ دھنک بھی وہیں آگئی۔

”میری کولیگ سلمیٰ۔ لیکچرر ہے ہمارے کالج میں۔“ فرزانہ نے اس کا تعارف کرایا۔

”ہیلو۔“ دھنک نے اس سے ہاتھ ملایا۔

”اور یہ۔“ دھنک ہے۔ آئینہ میگزین کی رپورٹر۔ ہم دونوں اکٹھی ایک ہی فلیٹ میں رہتی ہیں۔“

”اچھا اچھا۔“ سلمیٰ بولی۔ ”فرزانہ اکثر آپکی باتیں کرتی ہے۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

”مجھے بھی۔“ دھنک خندہ پیشانی سے بولی۔

اور جب وہ تینوں نمائش سے واپسی پر بس میں بیٹھیں تو۔

دھنک نے نڈھال ذہن سے سوچا۔ ابھی کتنے اور امتحان باقی تھے؟

معاذ سے کامران کا خیال آیا۔ کیوں نہ ہاں، کردے اور اس ساری جھنجٹ سے نجات حاصل کر لے؟

فلیٹ پر پہنچ کر اس نے فرزانہ سے کہہ ہی دیا۔

”فرزانہ امی جو کامران کی بات کر رہی تھیں ٹھیک ہے تم میری طرف سے انہیں ہاں لکھو۔“

بغیر شادی کروائے اسے ماں باپ نے چھوڑنا تو تھا نہیں۔ پھر وہ کامران ہو چاہے کوئی

بھی۔ کیا فرق پڑتا تھا۔ شادی ہی کرنی تھی، سیٹل ہی ہونا تھا۔

کامران اچھا لڑکا تھا۔ بظاہر کوئی خامی نہ تھی۔ پھر امی ابو کا بھی ذہنی بوجھ کم ہو جاتا۔

فرزانہ خوش ہو گئی۔ اس کا خیال تھا دھنک کا دھیان بٹ جائیگا۔ کتنی کھوئی کھوئی رہتی تھی۔

فرزانہ بھی تیار ہوئی تو دونوں نیچے آگئیں۔ بس میں بیٹھیں اور مقررہ جگہ کے قریب بس سٹاپ پر اتر گئیں۔ دونوں نے دیکھا اسی بس میں سے آصف بھی اتر کر انکی طرف آ رہا تھا۔ گل داؤدی کی آج بھی بہار آئی تھی۔ دور دور تک مختلف رنگوں کے مختلف تختے سجے تھے۔ کوئی گولائی کی شکل میں، کوئی چوکور، کوئی ٹکون تو کوئی نیلے کی شکل میں۔ اور۔ ایک جگہ تو سفید گل داؤدی سلوپ کی صورت میں اس قدر خوبصورت لگ رہی تھی کہ چند لمبے تو وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔

فرزانہ اور دھنک گھوم پھر رہی تھیں۔ دھنک اپنی نوٹ بک میں پوائنٹنس نوٹ بھی کرتی جا رہی تھی۔ کون سا رنگ تھا جو پیارا نہیں لگ رہا تھا۔ تختے اس قدر مہارت سے سجائے گئے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔

آصف اکیلا ہی فوٹو گرافی میں مصروف تھا۔

سلوپ میں بھی سفید گل داؤدی بہر حال نمبر لے گئی۔

ایک عجیب سی خوبصورتی تھی ان میں کہ جنہیں الفاظ بیان کرنے سے قاصر تھے۔ اوپر لگے نام سے پتہ چلا۔ بیگم نواب جہانگیر خان کے تھے۔ ان کا ذکر وہ پہلے بھی سن چکی تھی۔ مٹاڑ بھی تھی ان سے۔ گودی کھینے کا اتفاق نہ ہو سکا تھا۔

سفید ہی پھولوں کے پاس کھڑی اپنی محویت میں وہ رخ موڑے بغیر ہی قدرے پیچے بیٹی اور کسی سے جا کرائی۔

”سوری۔“ جلدی سے کہتے ہوئے اس نے پیچھے دیکھا۔

فخر عالم تھا۔ ڈارک گرے سوٹ میں ملبوس یونانی دیوتاؤں کی سی آن بان لئے تھا۔

وہ حجر میں سے تھا یہاں آ کر دھنک کو معلوم ہوا تھا۔

”تم۔ تم۔“ Why do you follow me? ”دبیزاری سے بولا۔

دھنک کو اسکی بات اچھی نہ لگی۔ پھر بھی اپنے آپکو سنبھالا۔

اور اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو؟“

READING
Section

فیصلہ کر لیا تھا۔
 ”جان من کچھ وقت ہمیں بھی دو۔“ آصف ڈیک پر آ بیٹھا تھا۔
 ”ہوں۔ کیا ہے؟“ وہ چونکی۔
 ”بھئی کن سوچوں میں گم ہو۔ کچھ ہم غریبوں کا بھی خیال کرو۔“
 ”مثلاً؟“ وہ مسکرا دی۔ اسکی باتیں ہی ایسی اوٹ پٹانگ ہوتی تھیں۔
 ”مثلاً یہ کہ۔“ وہ چند لمبے سوچ میں پڑ گیا جیسے سوچ رہا ہو کہ کیا کہے۔ ”آؤ دونوں شادی کر لیتے ہیں۔“
 وہ بے اختیار ہنس دی۔
 ”بڑا تیر مارا ہے۔“
 ”نہیں۔ میں سیر لیس ہوں۔“
 ”اچھا۔“
 ”ہاں۔“
 ”تو آؤ پھر۔ کڑی لیتے ہیں۔“
 ”مگر۔ کہاں کرینگے۔ کورٹ میں۔ سول میرج...؟“
 ”ہاں۔ جیسے تم کہو۔“
 ”تو آؤ نا۔ چلتے ہیں۔“
 ”چلو۔“ وہ واقعی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 آصف بھی ساتھ ساتھ چل دیا اور وہ دونوں چیف ایڈیٹر کو اپنی اپنی اسائمنٹ دکھانے اسکے آفس میں داخل ہو گئے۔
 اسائمنٹ۔ جس میں پھولوں کا ذکر تھا۔ یکم نواب جہانگیر خان کے سفید گل داؤدی کو نمبروں قرار دیا گیا تھا مگر۔ جو میں فخر عالم بھی تھا۔ یہ ذکر کہیں نہیں تھا۔

اداس چہرہ ویران آنکھیں۔ شاید اسی طرح ہی اسکے چہرے پر چھائی اداسی کی چھاپ ختم ہو، آنکھوں کی ویرانیاں دور ہوں۔
 اور۔ فرزانہ نے واقعی اسکی امی کو خط لکھ دیا۔
 صبح لیٹر بکس میں دھنک کے سامنے ڈالا۔
 اور دھنک چپ چاپ اپنے مقدر کے فیصلے کو کھتی رہی۔
 آج آفس میں بھی وہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ سوچوں میں گم۔
 ”ارے آپکے دانت کچھ زیادہ ہی خوبصورت نہیں ہیں؟“ پہاڑ پر فخر عالم کے یہاں مسکرا دینے پر کامران نے اسے کہا تھا۔
 وہ سرخ سی ہو گئی تھی۔
 ”میں ہمیشہ سچ بات کہتا ہوں آپ تمام کی تمام یعنی ساری کی ساری بہت خوبصورت ہیں اور خوبصورت چیز کی تعریف نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔“ کامران بولے جا رہا تھا اور۔
 فخر عالم بالکل سنجیدہ تھا اس دوران۔
 ”اب جاؤ۔ ناشتہ لگ چکا ہوگا۔“ اس نے کامران کو مخاطب کیا تھا۔
 ”ٹھہر ویار بات کرنے دو۔“ وہ پھر دھنک کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ”بائے داؤے آپکا نام کیا ہے مس؟“
 ”دھنک۔“ وہ دونوں دوستوں کی کھینچا تانی پر مسکرا رہی تھی۔
 ”یعنی تو س قزح یعنی رین بو۔ گوڈ۔ کتنا حسین نام ہے۔ کیوں فخر عالم؟“
 اور۔ فخر عالم خاموشی سے جھکتے ہوئے اپنے کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا تھا۔
 کامران سمجھ گیا فخر عالم اس معاملے میں کوئی رائے دینا نہیں چاہتا تھا۔
 ”اچھا Pretty lady ہم چلتے ہیں۔“ کامران نے کہا تھا۔
 اور پھر وہ دونوں چل دیئے تھے۔

ان سوچوں نے آج شاید اسلئے یلغار کر دیا تھا کہ آج اس نے اپنی زندگی کا اہم ترین

محبت کے سوا۔“ فرزانہ نے ہمیشہ کی طرح اسکی تسلی کیلئے کہا۔
 دکھ سے مسکراتے ہوئے اس نے نم آنکھیں پونچھ لیں۔
 ”فرزانہ تم نہ ہوتیں میرے ساتھ تو میں زندگی سے مشکل سے سمجھوتہ کر پاتی۔ کبھی کبھی مجھے
 لگتا ہے میں تمہاری تسلیوں اور حوصلہ افزائی کے سہارے زندہ ہوں۔“
 ”آؤ اوپر چلیں۔ ٹی وی دیکھتے ہیں۔“ فرزانہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔
 اور دونوں اوپر فلیٹ میں آگئیں۔

موسم نے ایک بار پھر اٹھرائی لی تھی۔ سردی آخری مائیس لے رہی تھی۔ کلیاں چنگ کر
 بہار کی آمد کا پتہ دے رہی تھیں۔
 ماٹوں کے پھولوں کی خوشبو روح میں اتر رہی تھی۔ سویٹ ہیز کی مہک بے خودی طاری
 کر رہی تھی۔ رنگ و بو سحر جگ رہی تھی!
 شام چائے کے بعد وہ اور فرزانہ فلینس کے نیچے والے لان میں بیٹھیں بہار کی مہکار
 سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔
 معائنے پر ڈی فلیٹ کا لاک آ کر فرزانہ کو ایک خط کا لفافہ تھما گیا۔ جو غلطی سے ڈاکر
 انکے گھر ڈال گیا تھا۔

فرزانہ نے جلدی جلدی کھولا۔ دھنک کی امی کا خط تھا۔ جو فرزانہ کے خط کے جواب میں
 آیا تھا۔ بقول انکے دھنک نے کامران کے حق میں ہاں کہہ کر نہایت غظندی کا ثبوت دیا تھا
 اور سبھی اسکے اقرار سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ اسکے علاوہ کامران کے گھر والوں کو بھی
 ہاں کہلوادی گئی تھی۔

دھنک کو اچانک لگا جیسے اس نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلبھاڑی مار دی تھی۔ مگر۔
 دوسرے ہی لمحے خیال آیا۔ کیسے؟ کس کا انتظار تھا اسے؟ کس نے آنا تھا؟ کس نے اسے
 اپنا نا تھا؟ جو وہ اس رشتے پر پچھتا رہی تھی۔ اور پھر فخر عالم کے سوا تو ہر شخص اس کیلئے ایک برابر
 تھا۔ وہ کامران ہی کی!

گزرے ہوئے لمحات۔ فخر عالم سے اسکی کورٹ کے آگے پوچھ گچھ، پھر اسکے پیچھے
 پہاڑ پر جا کر بہانے سے اسکے گھر کے اندر گھسنا۔ بعد میں بڑھتی ہوئی ملاقاتیں پیار و محبت کے
 عہد و پیمان اور بالآخر فخر عالم کی گھریلو پیچیدگیوں اور کسی اور کا حق مارنے سے ضمیر کی چنبن
 سے گھبرا کر اس کو چھوڑ دینا۔ سب یوں میں ہی اسکی نظروں میں گھوم گئے۔ اور شرتی آنکھوں
 کو نم کر گئے۔

”کچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ نئی دنیا بسانے کی سوچو۔ کیونکہ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں

”میں نے تمہیں مسٹر کامران سے بہت پہلے پر وہ پھنسا دیا تھا۔“
 ”اب کیا ہو سکتا ہے۔“

آصف نے گہری سانس لی۔

”ہاں اب کیا ہو سکتا ہے۔ کم از کم مٹھائی تو کھلا سکتی تھیں۔“

وہ اسکی معصومیت پر ہنس دی۔ دھیرے سے۔

”کل لا دوں گی۔ میرا تو خیال تھا کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ یہ کیا معلوم تھا کہ تمہیں پہلے سے خبر ہو چکی ہے۔“

”ایسی باتیں بھی کبھی چھپتی ہیں۔“

”نہیں۔“ ہنسی روکتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”ویسے اب بھی وقت ہے میری مانو تو یہ منگنی توڑ دو۔“ آصف نے مخلصانہ مشورہ دیا۔
 ”کیوں؟“

”اسلئے کہ پھر ہم دونوں شادی کر سکیں گے۔“

”بس کرو اب۔ کام کرو۔“

اور آصف نے واقعی سنجیدگی سے اپنے سامنے فائل کھول دی۔

آج گھر واپس جانے کیلئے وہ پھر بس سٹاپ پر کھڑی تھی۔

تبھی آصف کا وہاں سے گزر ہوا۔ موٹر بائیک روک کر اسے پیچھے بٹھالیا۔ دونوں چل پڑے۔

کچھ ہی دور گئے ہوئے کہ دھنک کی نظر پیچھے سے آتی گاڑی پر پڑی۔ فخر عالم تھا۔ آج

اپنی مرسیڈیز میں نہیں تھا۔ لینڈ کروزر چلا رہا تھا۔ بیس سے اسکے بھی آفس کارا سٹہ پڑتا تھا۔

اسکے چہرے کے تاثرات دیکھے بغیر ہی دھنک نے رخ آصف کی طرف کر لیا۔

معا انگی بائیک کے بالکل پاس سے زوں کی سی آواز آئی۔ آصف اپنا توازن قائم نہ

رکھ سکا اور وہ دونوں بسمت بائیک کے آہستہ سے لڑھک کر کچے میں جا پڑے۔

دن دھیرے دھیرے سرک رہے تھے۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی، دن پھیل رہے تھے، راتیں سکڑ رہی تھیں۔

دن کو موتیا، رات کو رات کی رانی جادو جگا رہی تھی۔

آج دنوں بعدِ نینم کا خط آیا تھا۔ لکھا تھا منگنی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے اور دھنک اور فرزانہ

مقررہ وقت پر پہنچ جائیں۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جانا پڑا۔ کہ یہ دنیا کا دستور تھا۔ اسے منگنی کی انگٹھی پہنانے

لڑکے والے آ رہے تھے۔

وہ اور فرزانہ دونوں گئی تھیں۔ منگنی کی رسم سادگی سے ہو گئی۔ کامران کی بڑی بہن نے اسے

ہیروں سے جگمگاتی انگٹھی پہنائی اور یوں وہ کسی اور کی امانت بن گئی۔

اگلے ہی دن فرزانہ اور وہ واپس آ گئیں۔ ڈیوٹی بھی تو تھی دونوں کی۔

ڈھیر ساری مٹھائی جو امی نے فرزانہ کے حوالے کی تھی وہ اس نے فلیٹس میں بانٹی۔ خود

اپنی ٹیچرز کو کھلائی۔

”میرے ساتھ آئندہ بات مت کرو۔“ یہ آصف تھا جس نے چھوٹے ہی خفگی کا اعلان کیا۔

”کیوں؟“ وہ مسکرائی۔

”یہ منگنی میرے ساتھ کرنی تھی۔“

”تمہیں کس نے بتایا میری منگنی ہو گئی۔“

”جناہ میری کزن پڑھتی ہے اسی کالج میں جس میں مس فرزانہ ٹیچرز کو تمہاری منگنی کی

مٹھائی کھلا رہی تھیں۔“

”اوہ۔“ تو بات اس طرح پھیلتی ہے۔

متوجہ ہو۔“

”فکر مت کرو یہ لڑکی متوجہ نہیں ہوتی۔“

”ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے۔“

اور دھنک پھر ہنسی صاف چھپائی۔

تھوڑی دیر دونوں خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔

”یار پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے اس نے یہ جان بوجھ کر کیا ہے؟“

”تو؟“

”ان امیروں کی بھی کیا شان ہوتی ہے۔ میں اکثر اس کو اسی راستے سے گزرتے دیکھتا ہوں۔ کبھی شوئر Driven نئے موڈل مرسیڈیز میں شان سے پیچھے بیٹھا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار جیب ہوتی ہے خود چلاتا ہے اسے۔ آج اس لینڈ کروزر میں تھا۔ روز روز گاڑیاں بدلتا رہتا ہے...“

اچھی بات ہے نا پیرہ ہے تو خرچ کرنا چاہیے۔“

”آج بڑی اسکی سائیڈ لے رہی ہو۔“

”نہیں خیر ایسی بات بھی نہیں۔“

”تمہیں یاد ہے اس پر جو مرڈر کیس بنا تھا تمہیں یہ کتنا برا لگتا تھا۔ کہتی تھیں دل چاہتا ہے

اسکی سیاہ چمکتی آنکھیں پھوڑ لوں... اب ٹوٹلی بدل گئی ہو۔“

”ظاہر ہے اصلی ملزم پکڑا جا چکا ہے اس بچارے کا کیا قصور؟“

”واہ۔۔۔ بچارا۔ کل کہو گی بے سہارا، بے آسرا، پھر کہو گی اکیلا۔“

”اب بس کرو آصف۔“ وہ مسکرا دی۔ ”تم تو اسی کو لے بیٹھے ہو۔“

”ویسے ایک بات ہے۔ ہے بہت شاندار۔ ٹال، ہینڈ سم، بالوں کا سٹائل دیکھو بلکہ رہن

سہن کا سٹائل دیکھو۔ کیا عایشان چیز ہے۔ میں دل ہی دل میں فیمن ہوں اسکا تمہیں پتہ

ہے؟“

اٹھ کر کپڑے جھاڑتے ہوئے دھنک نے دیکھا فخر عالم وہاں سے آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور ویو مرر میں سے وہ اب بھی ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یعنی یہ سب اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ اتنا قریب سے گزرا تھا کہ بائیک کا توازن ڈگمگایا تھا اور وہ دونوں کچے میں جاڑھکے تھے۔ گویا اسکا مقصد بائیک کو یا ان دونوں کو نقصان پہنچانا تھا بس ذرا گرا دینے کا شوق چرایا تھا۔

تو۔۔۔ اس طرح سے وہ اس کے آصف کیساتھ بیٹھنے پر انہیں گرا کر خوش ہو رہا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی دھنک کو اسکی اس بچوں کی سی حرکت پر ہنسی آگئی۔

جانے کب تک وہ آصف سے جلتا رہیگا؟ پتہ نہیں کامران سے اسکی مگنی کا معلوم ہوگا تو

کیا رد عمل ہوگا؟ بہر حال۔۔۔

”یہ۔۔۔ یہ مسٹر عالم اپنے آپکو سمجھتا کیا ہے؟“ آصف، دھنک اور فخر عالم کے کسی بھی

قسم کے تعلق سے ناواقف تھا۔ غصہ سے بائیک سیدھی کر کے اس پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ دھنک مسکرا رہی تھی۔

”کمال ہے تم مسکرا رہی ہو۔“

”تو روؤں بیٹھ کر۔“

”کچھ تو کہو نا۔“

”اچھا۔۔۔ شومارتا ہے۔ سر پھرا ہے۔ دماغ خراب ہے۔ اپنے آپکو بہت اونچی چیز سمجھتا

ہے... کافی ہے یا تھوڑا اور بھی کہوں؟“ وہ بھی اسکے پیچھے جا بیٹھی۔

”کافی ہے۔“ وہ اسی جھنجلاہٹ سے بولا۔

اور دھنک ہولے سے مسکرا دی۔

”ویسے یہ سب اس نے جان بوجھ کر تو نہیں کیا تھا؟“

”جان بوجھ کر کیوں کرتا؟“ دھنک نے بات بنائی۔

”یار تم جیسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر دل کیا ہوگا کہ زوں کر کے تیزی سے گزر جاؤ شاید

”ہاں۔ جیسی تو اتنی سائید لیا کرتے تھے اسکی۔“

”تمہیں اب بھی برا لگتا ہے؟“

”ہاں۔“

”اب تو بقول تمہارے یہ بچارا ہو گیا ہے۔ یعنی قصور وار نہیں ہے۔“

”ہاں۔“

”پھر؟“

”پھر بھی اچھا نہیں لگتا۔“

”کیوں؟“

”بھئی میری مرضی۔ دھنک جھنجلا اٹھی۔ سوائے فخر عالم کے کوئی اور بات کرتا ہی نہیں تھا۔“

”اتر جاؤ میری بانیک سے۔“ اسکا منہ پھولا پھولا تھا۔

”اتر رہی ہوں۔“ فلیٹس کا گیٹ آچکا تھا۔ ”خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ آصف نے بھی اسی لہجے میں کہا اور۔

آگے بڑھ گیا۔

آج شہر کی آبادی سے پرے مضافات میں بیگم نواب جہانگیر خان کے ہاں ڈنر تھا۔ بیگم صاحبہ بیوہ تھیں، تقریباً چالیس یا پچاس سال عمر تھی، سنا تھا۔ بہت خوبصورت تھیں، بہت رکھ رکھاؤ والی تھیں۔ انکی رہائش گاہ خاص طور سے انکے باغات دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے یہاں کی پرانی طرز کی راہداریاں، بارہ دریاں اب بھی باہر سے آنے والوں کیلئے بہت کشش کا باعث تھیں۔

آج کا ڈنر کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر و بیشتر ایسی دعوے تھیں دیا کرتی تھیں۔ شاید پرانی روایت چلی آ رہی تھی یا پھر شاید بیگم صاحبہ اپنی تنہائی دور کرنے ایسی محفلیں سجایا کرتی تھیں۔ بہر حال۔

آج دھنک اور آصف بھی وہاں پہنچنے کو تیار تھے۔ آصف بطور فونو گرافر اور دھنک نے بیگم صاحبہ کا انٹرویو کرنا تھا۔

سفید مہین لباس میں وہ آسمان سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی۔ وہ بہت ایکساٹینڈ تھی۔ بیگم صاحبہ کی شخصیت اس کیلئے خاصی اٹریکشن کا باعث تھی۔ بلکہ دونوں ہی بہت خوش تھے۔ میگزین میں بیگم صاحبہ، مہمانوں اور انکی رہائش گاہ و باغات کی تصویریں بھی آجاتیں اور ساتھ میں ان کا انٹرویو بھی۔

شام کے دھند لگے اتر آئے تھے۔ پرندوں کے غول اپنے اپنے آشیانوں کی طرف رواں دواں تھے اور۔ قریب ہی نالے کے کنارے چلتا چھوٹا سا گنڈریا بھیڑ بکریوں کے بوے سے ریوڑ کو ہانکتا گھرواپس جا رہا تھا۔

آصف کی بانیک پر بیٹھے دھنک اور آصف چلتے چلے گئے۔ آٹھ بج چکے تھے وہاں پہنچنے

فخر عالم اسے کئی بار دیکھ چکا تھا، جانتا بھی تھا۔ دھنک نے اسے بتایا تھا وہ اسکا کوئی گھوڑا تھا۔
 ”سوری۔۔ مجھے آپ ایکسکیوز کر دیں۔“ وہ اٹھ کر ایک طرف ہو گیا۔ ”ہاں بیگم صاحبہ
 کی اپنی مرضی۔“

”کم آن ڈارنگ! کیا فرق پڑتا ہے۔“

فخر عالم مسکرا دیا۔ خوبصورتی سے۔

”Sorry Ma'am—I can't afford any scandle.“

”آپ سکیئنڈلز سے اتنے خائف کیوں رہتے ہیں؟“

آصف خاص صحافت کے انداز میں پوچھنے لگا۔

”میں کوئی جواب نہیں دوں گا۔“ وہ اپنے مخصوص مبہم انداز میں مسکرایا۔ ”ورنہ وہ میرا
 انٹرویو بن جائیگا۔“

اور آصف صرف بیگم صاحبہ کے ہی چند پوز کیمرے میں اور کچھ بات چیت کاغذ پر محفوظ
 کر کے واپس آ گیا۔

”بات کچھ بنی کہ نہیں۔“ دھنک نے پوچھا۔

”فخر عالم صاحب نے تو صاف ایکسکیوز کر لیا۔ ہاں بیگم صاحبہ کی تصویریں اور انٹرویو کر لیا۔
 ویسے پتہ نہیں کیوں میری چھٹی حس کہتی ہے دونوں میں کچھ گڑبڑ ہے۔ اگر دونوں میں نہیں تو
 ایک میں تو ہے ہی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ۔۔ بیگم صاحبہ مسٹر فخر عالم پر ذرا ضرورت سے زیادہ ہی مہربان نظر آتی
 ہیں۔“

اور دھنک بے اختیار ہنس دی۔

”پریس والوں سے جیسی تو لوگ گھبراتے ہیں۔“

”صحافت کی ایک روح ہوتی ہے۔ اسے سمجھنے کیلئے دماغ ہونا چاہیے سمجھیں۔“

اندر بہت رونق تھی، بڑی چہل پہل تھی۔ علاقے کی قریباً تمام ایلٹیٹ کلاس انوائیڈ تھی۔
 جینٹس قیمتی سوئس اور لیڈرز بیش قیمت لباس پر دیدہ زیب جیولری پہنے تھے۔ اعلیٰ کوالٹی کے
 سگریٹس کی اروما تھی۔ فرانس کی پرفیومری کی مہک تھی!

ادھر ادھر سے کانوں میں آواز پڑی۔ ڈنر فخر عالم کے اعزاز میں دیا گیا تھا!

وسیع و عریض لان میں لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے۔ کچھ ادھر ادھر رہ رہ رہ رہ رہ رہ رہ رہ رہ رہ
 پھر بارہ دریوں میں سے ارد گرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کچھ شاید باغات
 میں محو خرام ہو گئے۔ بہر حال۔

روشنیوں کی چکاچوند میں انہوں نے دیکھا۔ سامنے ہی مرمریں ستونوں والے محرابی برآمدے
 میں بہت قیمتی اور خوبصورت صوفے پر بیگم صاحبہ تشریف فرما تھیں اور۔۔ اور۔۔ ساتھ میں
 اسی صوفے پر ایک طرف ہو کر فخر عالم بیٹھا تھا۔ سیاہ قیمتی سوٹ میں بہت ڈشنگ لگ رہا تھا۔
 گویا اتنے سارے مہمانوں میں وہ مخصوص مہمان تھا کہ میزبان جس پر خاص عنایت کئے
 تھے۔ اسکو اپنے پاس صوفے پر جگہ دی تھی۔

جہاں باقی سب میزبان کی رہائشگاہ، رکھ رکھاؤ کے معترف نظر آ رہے تھے وہاں بیگم
 صاحبہ فخر عالم سے باتوں میں مجھیسے اطراف ہی سے بے خبر تھیں۔
 ”ہو جائے ایک تصویر؟“ آصف نے دھنک سے کہا۔

”پہلے اجازت تو لے لو۔“ اسے معلوم تھا فخر عالم پریس والوں سے دور بھاگتا تھا اور اگر
 چپکے سے تصویر لے لی گئی تو میگزین میں دیکھ کر دھاڑنے لگے لگا۔

”ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔“

دھنک دور سے دیکھ رہی تھی۔

آصف اٹکے پاس گیا۔

”ایکسکیوز می۔ کیا میں اپنے میگزین کیلئے آپ دونوں کی تصویر لے سکتا ہوں؟“

وہ اسکی عادات سے اب تک بخوبی واقف ہو چکی تھی۔ وہ کسی طور پر بھی Lime light میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ بقول اسکے وہ پریس والوں سے الرجک تھا۔
 ”اچھا۔ ٹھہرو میں یہاں کی کچھ تصویریں لوں گا۔“ وہ تصویریں لینے لگا۔
 دھنک نے دیکھا۔ چاق و چوبند باوردی بیرے اوؤل ہیپڈ تالاب کے گرد لگی ٹیبلز پر کھانا لگانے لگے تھے۔

یہاں جا بجا خوبصورت لیپ پوسٹس مدھم مدھم روشنی بکھیر رہے تھے۔ تالاب کا گہرا نیلا پانی، کھلا آسمان اور مدھم مدھم روشنیاں۔ عجیب خواب آور سا ماحول تھا۔
 تبھی۔۔۔ کھانا لگنے کا اعلان ہوا۔

سبھی ٹیبلز کے گرد سمٹ آئے۔ انواع و اقسام کے کھانے لگے تھے۔ لمب روست چکن تک، باربی کیو، کئی قسم کی سلاد، سویٹ ڈشز!
 مہمان اپنی اپنی پلیٹوں میں کھانا لیکر یہاں وہاں بکھرتے ہوئے خوش گپیوں کے دوران سحر انگیز ماحول میں لذیذ کھانوں کا لطف لینے لگے۔

”ایک پوائنٹ اور“۔ آصف پلیٹ میں کھانا لئے اسکے پاس آیا۔
 ”پھر کیا ہوا؟“

”تم نے خیال کیا تھا۔ اول نمبر سفید گل داؤدی کو قرار دیا گیا تھا۔“
 ”تو؟“

”ججز میں مسٹر فخر عالم بھی تھا۔“
 ”پھر؟“

”خود بھی کچھ سمجھا کرو۔ بیگم صاحبہ سے کچھ دلچسپی ہے جیسی تو...“
 ”بڑی دور کی کوڑی لائے ہو۔“

”مانتی ہوتا۔“

”آصف ایمان کی کہو سفید گل داؤدی سب میں ساڑھن کن تھی یا نہیں؟ تم ججز میں سے

”بس بس میں تمہاری تعریف نہیں کروں گی۔“

”تعریف شاید کچھ نظر آئی ہے جی تو کہہ رہی ہو۔“

”ہونہہ۔۔۔ چالیس بیالیس سالہ بیوہ اور تیس بیس سالہ لڑکا۔ تم نے بھی کیا جوڑی ملائی ہے۔“

”مان او۔ کچھ نہ کچھ ہے۔“

”میں نہیں مانتی۔“

”اسلئے کہ ابھی شروعات ہیں اور بات یک طرفہ ہے یعنی صرف بیگم صاحبہ کی طرف سے ہے بعد میں دوطرفہ ہو جائیگی۔“

”اسکی اپنی بیوی کدھر ہے؟“ دھنک نے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

”ہوگی کہیں فرینڈز وغیرہ کیساتھ۔ سنا ہے وہ بھی خاصی ایڈوانس ہے۔“

”چلو جانے دو۔ آؤ اس طرف بارہ دری چلتے ہیں۔“

اور دونوں وہاں سے چل دیئے۔ دور بائیں دھنک کی نظر فخر عالم پر پڑی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں پتہ ہے ڈنر کے مہمان خصوصی مسٹر فخر عالم ہیں۔“

”ہاں۔ کچھ دیر پہلے ہم دونوں نے یہ بات ایک ساتھ سنی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے

یاد دلایا۔

”ویسے ایک اور چیز میں نے نوٹ کی۔ یہ مسٹر عالم تو بہت خوش اخلاق ہیں۔ جیسا

میرا خیال تھا ایک امیر مغرور شخص ہوگا۔ ایسا تو بالکل نہیں۔ بڑی خوشگواہی اور خوش خلقی سے بات کر رہا تھا۔“

”انٹرویو میں اسکا کوئی ذکر مت کرنا خدا کیلئے۔“ دھنک خائف سی بولی۔

”نہیں کروں گا مگر کیوں؟“

”بس اس نے جو منع کر دیا سو منع کر دیا۔“

READING
Section

فخر عالم کا سائیڈ تھا۔

”تم تو بس سوڈل بن کر کھڑی رہو۔ سارا کام مجھے کرنا پڑ رہا ہے۔ انٹرویوز فونو کرانی...“
آصف حسب عادت فری فریک لہجے میں بولا۔

”تو کیا ہوا۔ مشکل وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں... اور پھر میں تمہارے لئے سوئٹ ڈش بھی تولائی ہوں...“
”کہاں ہے؟“

”اسی میں سے کھاؤ۔ الگ پلیٹ نہیں لاسکتی تھی۔“ دھنک نے اپنی پلیٹ اسکی طرف بڑھائی۔

”جب سے کامران صاحب کی مہرگی ہے تم پر کامل ہوتی جا رہی ہو دن بدن۔“ وہ اسکی پلیٹ میں سے چیچ بھر کر منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

دھنک کی نظریں فخر عالم پر پڑیں۔ مارے غصے کے بے گل سالگ رہا تھا۔ کان ادھر ہی لگے تھے۔۔ کامران کے نام پر چونک سا پڑا۔

”ویسے تمہاری منگنی کی انگوٹھی ہے زبردست۔ لگتا ہے بڑی آسامی ہے۔“

بے دلی سے باتوں میں معروف فخر عالم بے چین سا نظر آنے لگا۔

”مجھے آسامی واسامی کانہیں پتہ میں نے صرف کامران سے منگنی کی ہے۔“ دھنک دھیرے سے بولی مگر۔ لگتا تھا فخر عالم ہر تن گوش تھا۔ کیا دھیمی کیا اونچی سبھی باتیں سن رہا تھا۔
معا آصف کی نگاہ اپنی گھڑی پر گئی۔

”دھنک چلتے ہیں دیر ہو رہی ہے۔“ وہ آخری چیچ منہ میں ڈالتے ہی بولا۔

”ہاں۔“ دھنک نے فوراً پلیٹ اسے تھمائی۔

آصف جا کر پلیٹ میز پر رکھ آیا۔

اور دونوں باہر گیٹ کی طرف بڑھے۔

ہوتے تو اپنی رائے سفید پھولوں کیلئے ہی دیتے یا نہیں؟ اس نے سرزنش کے انداز میں کہا۔

”تم ہی نے تو کہا بڑی دور کی کوزی لائے ہو۔“ وہ مسکین سی شکل بناتے ہوئے بولا۔
”غصہ آیا تھا مجھے۔ خواہ تو اسے کسی پر شک کرنا اچھی بات نہیں۔“

”ہم صحافی شک نہ کریں تو سچائی تک کیسے پہنچیں۔ ہمیں پہلے شک پڑتا ہے۔ پھر ہم پیچھا کرتے ہیں اور پھر کہیں جا کر حقیقت تک پہنچتے ہیں سمجھیں؟“
”بس بہت سمجھ گئی۔ اب کھانا کھاؤ۔“

آصف قدرے آگے بڑھا اور مہمانوں کے ہجوم میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
تبھی۔ دھنک کو اپنے آس پاس فخر عالم کی مخصوص مہک محسوس ہوئی۔
دائیں طرف دیکھا واقعی وہ کھڑا تھا۔

”تم۔ یہاں رات کے وقت کیوں آئی ہو؟“ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔
”ڈنرات کو ہی ہوتا ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”تم کیوں بھول جاتی ہو کہ تم ایک لڑکی بھی ہو۔“ اس کے لہجے میں تیزی آئی۔
”میری مرضی میں کچھ بھی کروں۔“

اور۔ فخر عالم نے جیسے غصہ بڑی مشکل سے ضبط کیا۔

”دل چاہتا ہے تمہیں اتنا ماروں اتنا ماروں کہ۔ ساری جرنلزم دھری رہ جائے۔“

اسے مزید تیز ہوتے دیکھ کر وہ دوسری طرف چل دی۔ کیونکہ وہ یہاں کی بہت اہم شخصیت تھا۔ لوگوں کی نظریں اس کیساتھ ساتھ دھنک پر بھی پڑ سکتیں تھیں اور۔
وہ بھی کوئی سیکنڈل نہیں چاہتی تھی۔

آصف نے چند اور مہمانوں کے خیالات انکے میزبان کے بارے میں نوٹ کئے۔ کچھ تصویریں اور بنائیں اور واپس دھنک کو ڈھونڈتا اس تک آپہنچا۔

پاس ہی تھوڑے فاصلے پر جانے کہاں سے گھوم پھر کر فخر عالم بھی آکھڑا ہوا تھا۔ پلیٹ میں کھانا لے کر ایک لڑکی سے جو گفتگو تھا۔ شاید فریڈ تھی۔ بہر حال لڑکی کی ان کی طرف پیٹھ تھی اور

اور

خط پر نظرس دوڑانے لگی۔

خط پڑھ کر ایک نظر دھنک پر ڈالی۔ وہ اب بھی خالی خالی نظروں سے خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ چہرے پر کسی بھی قسم کا جذبہ لئے بغیر۔

فرزانہ نے گہری سی سانس لی۔ خط تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں ڈالا۔ لفافہ درمیانی میز پر رکھا۔

”تم پریشان ہو؟“ فرزانہ کا لہجہ اداس تھا۔

”نن... نہیں تو“۔ وہ چونکتے ہوئے اسکی طرف دیکھنے لگی۔

اسکے خوبصورت لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ جسے پھر فرزانہ سمجھ نہ پائی۔ اداسی کی تھی خوشی کی تھی یا یوں ہی بغیر کسی مطلب کے؟

”دفع کرو۔ کامران میں کوئی سرخاب کے پر تھوڑی لگے تھے۔ کہیں اور نکھی ہوگی تمہاری قسمت۔ پہلے بھی اچھے خاصے رشتے آچکے ہیں تمہارے۔ آگے بھی امید رکھنی چاہیے۔“

”مجھے کب شادی کی اتنی پرواہ رہی ہے۔ امی کی خواہش پر ہاں کہہ دی تھی۔“

”وہ تو ہے۔ چھوڑو پرے اس ٹوپک کو۔ آؤ اٹھو کھانا کھائیں۔“ فرزانہ نے اسے ہاتھ سے اٹھایا۔

دھنک کی محسوسات کچھ عجیب سی ہو رہی تھیں۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ چپ چپ سی تھی۔ اسے کامران سے کوئی قلبی لگاؤ نہیں تھا یہ تو طے تھا۔ اسے شادی کی کوئی خاص پرواہ تھی

ایسی بھی بات نہیں تھی پھر؟ پھر کیوں اسے چپ سی لگ گئی تھی۔

تحقیر و تضحیک، تو ہیں! یقیناً اسے یہ احساس تھا۔

اور پھر۔ اچانک اسکے ذہن میں کوند اسالپکا۔ کہیں یہ فخر عالم کی کارستانی تو نہ تھی؟ اس رات بیگم جہانگیر کے یہاں ڈنر پر وہ آصف اور دھنک کو کامران سے اسکی منگنی کا ذکر کرتے سن

چکا تھا۔ شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر کیوں؟

گرمی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ گلاب کھل اٹھے تھے، موتیا کی مہک فضاء میں رچ بس گئی تھی اور۔۔۔ رات کی رانی راج کرنے لگی تھی۔

آفس سے تھکی ہاری وہ فلیٹ پر پہنچی تو حسب عادت بچن بکس پر نظر ڈالی۔ پھر خوشی سے کھل اٹھی۔ گھر سے خط تھا۔ دنوں بعد کوئی خط آیا تھا۔ امی کو شاید کاموں سے فرصت نہیں ملتی تھی اور نینم تو تھی ہی ست۔ آج مہربانی کر ہی ڈالی تھی۔

اندازے چھونے سے لوگ روم میں آکر اس نے بیگ کو نے میں کھڑے بیگ سے لٹکایا۔ کھڑکی کے قریب آرنڈ چیر پر ٹانگیں سیدھی پھیلا کر بیٹھتے ہوئے اہتمام سے خط کھولا۔

سلام دعا خیریت کے بعد لکھا تھا۔

”باجی! کامران کی بہن کا خط آیا تھا لکھا تھا۔“ کامران تین سال کیلئے امیریکہ جا رہا ہے۔

ظاہر ہے تین سال تک بات التوا میں پڑ جائیگی۔ اسلئے ہم آپکو لٹکائے رکھنا نہیں چاہتے۔ آپ چاہیں تو دھنک کی شادی کہیں اور کر سکتے ہیں...“

اور دھنک دیر تک یوں ہی بیٹھی خالی خالی نظروں سے سامنے تکی رہی۔

تجھی فرزانہ آگئی۔

”کیوں؟ خیریت؟“ فرزانہ ہانڈ گئی اسکی گود میں رکھے خط سے اور اسکی خالی خالی

نظروں سے۔

دھنک مسکرا دی۔ ایسی مسکراہٹ جس میں نہ خوشی تھی نہ اداسی۔

بغیر نہ سے کچھ کہے آہستہ سے خط فرزانہ کو پکڑا دیا۔

فرزانہ نے خط لیتے ہوئے اپنا بیگ بیگ سے لٹکایا۔ واپس آکر اسکے مقابل کرسی پر بیٹھی

خود تو شادی کر لی تھی اب اسکی راہ میں کیوں روڑے انکار ہا تھا؟
اگر اس نے واقعی ایسا کیا تھا تو یہ اسکی شان کی نفی کرتا تھا۔
اور اگر اس نے یہ سب نہیں کیا تھا تو پھر کامران نے اسکی توہین کی تھی۔
وہ سوچتی چلی گئی۔

اور۔۔۔ اگر کامران کی یہ بات درست تھی کہ وہ تین سال کیلئے اسے پابند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تو یہ اسکی صاف گوئی تھی۔ اور صاف گوئی اسے ہمیشہ پسند رہی تھی گو تلخ ہوتی تھی اکثر!
”کل تو پینٹنگز کی نمائش بھی دیکھنے جانا ہے۔ دیکھنا تمہاری پینٹنگ کو پرائیز ملے گا۔“
فرزانہ نے اسکا دھیان بٹانے کو کہا۔

”کیا پتہ اتنی خاص تو نہیں۔“ وہ آہستہ آہستہ اپنے آپے میں آرہی تھی۔

اس نے انہی ڈیزیز کو کیونوں پر اتارا تھا جو اس نے فخر عالم کے جنگل اور آس پاس میں دیکھے تھے۔

”تھوڑی دیر ریٹ کرتے ہیں پھر چلتے ہیں ڈاکٹر ماریا کی طرف۔ ابھی آتے ہوئے کہہ رہی تھیں دونوں آنا ان کی بہن کی شادی کی موڈی دیکھیں گے۔“
”لیکن تمہیں پتہ ہے مجھے ایسی موڈیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔“
”نہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ سارا وقت بس میگزین کا آفس پھر اسکی خدمت میں ادھر ادھر گھومنا اور اسایکٹمنت تیار کرنا...“ وہ اسکا خیال بدلنا چاہتی تھی۔

دھنک نے گہری سانس لی۔ پھر مسکرا دی۔

اب کے اسکی مسکراہٹ میں کوئی تناؤ کوئی پریشانی نہ تھی۔

”اچھا۔ تھوڑی دیر سوتے ہیں پھر چلیں گے۔“ وہ کرسی پر سے اٹھنے لگی۔ اب اسکی بات میں بھی کوئی بوجھل پن نہیں تھا۔

فرزانہ خوش ہو گئی۔ اسے تسلی ہوئی۔ ایک عرصہ سے اکٹھے رہنے سے وہ اسے بہنوں کی طرح چاہنے لگی تھی۔ اس کے دکھ میں دکھی ہو جاتی تھی اسکی خوشی میں خوش!

آج دھنک اور آصف نے جلدی جلدی آفس کا کام منٹایا اور ٹھیک دس بجے نمائش پر آرٹ گیلری جا پہنچے۔ وہ دونوں بطور پورٹرز گئے تھے۔ ساتھ ہی دھنک نے اپنی پینٹنگ کا حشر بھی دیکھنا تھا۔ فرزانہ ان سے پانچ دس منٹ پہلے ہی پہنچ کر وہیں ایک طرف منتظر کھڑی تھی۔

آصف تصویریں لے رہا تھا۔ دھنک مختلف لوگوں کے بنائے شاہکار دیکھتی ملاحظہ ہوتی نوٹ بک میں نوٹ بھی کرتی جا رہی تھی۔ فرزانہ ساتھ ساتھ تھی۔

”کتنے زندہ پھول ہیں اور اطراف کا ماحول۔ دل چاہتا ہے یہیں رہ جاؤ۔“ کسی نے گزبھر کے فاصلے پر کہا تھا۔

دھنک نے مڑ کر اپنے بائیں طرف دیکھا۔

اسکی پینٹنگ کے پاس کھڑی بیگم جہانگیر خان تھیں اور ساتھ۔۔۔ فخر عالم سفید قیمتی سوٹ میں ملبوس اپنی سحر انگیز شخصیت سے پورے ماحول کو سحر انگیز بنا رہا تھا۔
”دھنک۔۔۔ پینٹنگ زیادہ خوبصورت ہے یا نام؟“ بیگم جہانگیر نے فخر عالم کو مخاطب کیا۔

جانے کیسے فخر عالم اور دھنک کی نظریں ایک ساتھ ایک دوسرے کی طرف اٹھیں۔

ایک ہل کو دونوں طرف قدیلے سی جل اٹھیں اور پھر۔۔۔ ایک ساتھ ہی بچھ گئیں۔

”دھنک؟ پینٹنگ؟“ فخر عالم نے بیگم جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے خوبصورتی سے کندھے اچکائے۔ ”مجھے ان چیزوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔“ اس نے خالص جھوٹ بولا تھا۔

”اوہ۔۔۔ تو پھر آئے کیسے آپ؟“

”آپ بھول رہی ہیں میں آیا نہیں لایا گیا ہوں“۔ وہ مسکرایا۔

”You — naughty boy.“۔ انہوں نے عجیب سی نظروں سے اسکی

آنکھوں میں دیکھا۔

اور۔ فخر عالم اسکی نظریں نظر انداز کرتے ہوئے جلدی سے ایک پینٹنگ کو دیکھنے لگا۔
دھنک ایک قدم اور آگے بڑھی۔ باقی پینٹنگز دیکھنے۔

پھر جانے کیسے؟ دھنک کو اپنے بال کھینچنے سے محسوس ہوئے۔ مڑ کر پیچھے دیکھا۔ فخر عالم اسی
کے پیچھے کھڑا ایک پینٹنگ بغور دیکھ رہا تھا اور دھنک کے چند خوبصورت بال اسکے کوٹ کے
بٹن میں الجھ کر رہ گئے تھے۔

وہ پریشان سی اپنے بالوں کو دیکھنے لگی۔

”Your Highness! آپکے بٹن میں اس لڑکی بچاری کے بال اٹک گئے ہیں“۔

بیگم جہانگیر بڑی ادا سے کہتے ہوئے اسکے بال فخر عالم کے کوٹ کے بٹن سے الگ کرنے لگیں۔
تبھی کہیں جا کر فخر عالم کو ہوش آیا۔ ایک نظر جیسے نہ چاہتے ہوئے بھی دھنک کی بڑی
بڑی ہیزل آنکھوں میں جھانکا اور پھر جیسے اپنی مسکراہٹ بمشکل دباتے ہوئے اپنے بٹن اور
دھنک کے بالوں کو سلجھتے ہوئے دیکھنے لگا۔

”لڑکی خوبصورت تھی“۔ وہ دونوں آگے بڑھے تو بیگم جہانگیر کی آواز سنائی دی۔

”شاید“۔ فخر عالم نے لاپرواہی سے کہا۔

”مگر حضور تو بڑے غور سے اسکی آنکھوں میں جھانکے تھے“۔

”اب آنکھیں ہیں بھنک گئی ہوگی۔ میں کیا کر سکتا ہوں“۔ وہ خوبصورتی سے مسکرا رہا تھا۔

بیگم جہانگیر کو جیسے فخر عالم کا دھنک کی آنکھوں میں ڈیکھنا اور پھر انکی بات کے جواب میں

کہی گئی بات اچھی نہ لگی، چہرے پر چپ سی ابھرائی۔

اور۔ دھنک سوچنے لگی کہیں آصف بیگم جہانگیر کے یہاں ڈنر پر ان دونوں کے بارے

میں صحیح تو نہیں کہہ رہا تھا؟

پر۔ بات آج بھی ایک طرف ہی لگ رہی تھی!

اسے حیرت بھی ہوئی۔ بیگم جہانگیر کی فخر عالم سے اس قدر بے تکلفی پر۔ پھر دونوں کی

عمروں میں بھی خاصا فرق تھا!

”ہوتا ہے ہوتا ہے“۔ آصف آپہنچا تھا۔ اور بیگم جہانگیر اور فخر عالم کو ایک ساتھ ان کے

پاس سے گزرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں“۔

”میں کیوں پریشان ہوگئی“۔ دھنک جلدی سے بولی، دل میں چور جو تھا۔

”میرا مطلب ہے حیران ہونے کی ضرورت نہیں“۔ اس نے اپنی بات کی تصحیح کی۔

”ویسے یہ سب کیا ہے آصف“۔ وہ کچھ الجھی الجھی سی بولی۔

”مارو گولی۔ کرنے دو لوگ جو کرتے ہیں۔ ہمیں کیا۔ باقی پینٹنگز دیکھو“۔ فرزانہ کچھ بوری

ہوتے ہوئے بولی۔

”ہاں ہاں پینٹنگز دیکھو“۔ آصف نے جلدی سے فرزانہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

تینوں قدرے اور آگے بڑھے۔

”بائے داوے مس قوس قزح آج تمہاری انگلی پر ڈائمنڈز کا ڈھیر نظر نہیں آ رہا“۔ آصف

حسب عادت اسے چھیڑنے لگا۔

”اسلئے کہ میری منگنی ٹوٹ گئی ہے اور انگوٹھی میں نے اتار دی ہے“۔

کچھ فاصلے پر کھڑے بظاہر پینٹنگ پر نظریں جمائے فخر عالم کے کان کھڑے ہو گئے۔

”دیکھو اب انکار مت کرنا پلیز! اب تو منگنی کا بہانہ بھی نہیں رہا۔ مس فرزانہ آپ ہی

میری سفارش کر دیں۔ میری تو سنتی ہی نہیں“۔

”کیا؟“ فرزانہ اسکے لب و لہجے پر ہنس دی۔

”کب سے میں درخواستیں دے رہا ہوں کہ مجھ غریب پر نظر کرم فرما کر مجھ سے شادی

کر لے مگر یہ ہے کہ سنتی ہی نہیں“۔

”کیوں دھنک۔ کیوں نہیں سوچتی ہو اسکی پروپوزل پر“۔

”ہاں“۔ اس نے مختصراً کہا۔

”ویسے You are great اس کے اتنا کچھ کرنے پر بھی اسے معاف کر دیا“۔ بیگم جہانگیر بولیں۔

فخر عالم نے کچھ بھی کہے بغیر لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

تو فریدہ امیریکہ میں تھی۔ جسے فخر عالم اکیلا نظر آتا تھا!

اور۔ اسکی غیر موجودگی میں خالی وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ بیگم جہانگیر کیساتھ گھومتا

پھرتا تھا۔ بہر حال۔

اسے کیا وہ کچھ بھی کرتا؟ یا اسکا مسئلہ نہیں تھا۔ فریدہ کو واپس آ کر اپنا پرانہ بلیم سنبھالنا چاہیے تھا۔

”دھنک، دھنک۔ مسٹر عالم اب بھی مجھے گھور رہا ہے“۔ وہ پھر دھیرے سے بولا۔

”تو میں کیا کروں“۔ اسے ہنسی آگئی۔

”شادی کر لو مجھ سے۔ پھر یوں نہیں گھورے گا“۔

”اچھا بابا“۔

”کیا مطلب؟“ وہ خوش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”شادی کرنے کو کہہ رہے ہوتا“۔

”ہاں“۔

”کر لو گئی“۔

”مجھ سے“۔ اسے اندیشہ تھا اسکے ذہن میں کوئی اور نہ ہو۔

”ہاں ہاں تم سے“۔

اور فخر عالم نے پھر ایک سرسری نظر دونوں پر ڈالی۔

”بھئی میں تو جاتا ہوں ادھر سے۔ یہ مجھے چھوڑ دینا نہیں“۔

اور آصف واقعی دوسری طرف نکل گیا۔

تبھی۔ فخر عالم اسکے پاس چلا آیا۔

”تو تم بھی اسکی سائیڈ لینے لگیں“۔ وہ اپنی نوٹ بک میں کچھ پوائنٹس نوٹ کرتے ہوئے

بولی۔

”ظاہر ہے تمہارا کوئیگ ہے میرا بھائی ہے“۔ اب تک وہ دھنک کے ناطے آصف کو کئی

بار مل چکی تھی، بات چیت کر چکی تھی۔

اور۔ دھنک دونوں کو خوشگیس نظروں سے دیکھتے ہوئے فخر عالم اور بیگم جہانگیر کو درمیان

میں چھوڑ کر ان سے آگے بڑھ گئی۔

آصف جھٹ سے وہاں جا پہنچا۔

”ایسے کام نہیں چلے گا۔ آج فیصلہ کرنا ہوگا“۔ وہ اسکا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا چیز ہو، ہٹو آگے سے“۔

”اول ہوں۔ مجھے جواب چاہیے“۔

”کیا بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو“۔ وہ تو سچ سچ گلے پڑ گیا تھا۔

جبکہ وہ یہ بھی سمجھ رہی تھی وہ یہ سب مذاق کر رہا تھا، عام حالات میں وہ اسکی بہت عزت

کرتا تھا۔

”میں تمہیں بچہ دکھائی دیتا ہوں“۔

اور جانے کیوں؟ فخر عالم نے اسے بری طرح گھورا۔

”باپ رے“ آصف کٹٹی سہلاتے ہوئے دھنک کے سامنے سے ہٹ کھڑا ہوا۔

”یہ۔۔ یہ جو مسٹر فخر عالم ہے۔ اسکا یا تو تم سے کوئی کنکشن ہے یا مجھ سے کوئی بیر ہے“۔ وہ ہنسی

آواز میں بولا۔

دھنک دھیرے سے مسکادی۔ ضرور فخر عالم نے نظروں ہی نظروں میں اسے تہیہ کی تھی۔

معا سے خیال آیا اسکی بیوی کہاں تھی؟ اور یہ بیگم جہانگیر کب سے اسکی چہیتی بن گئی تھیں؟

”فریدہ ابھی تک امیریکہ میں ہی ہے؟“ بیگم جہانگیر نے بڑا بروقت سوال کیا تھا فخر

عالم سے۔

اس پر کیوں اتنا عجب ڈال رہا تھا؟ حق جتا رہا تھا؟ آصف سے کیوں اتنا جھلس تھا؟
تمام راستہ وہ یہی سوچتی آئی۔ رات بستر پر لیٹی تو بھی رات گئے تک یہی تانے بانے
جتی رہی۔

جانے کیوں وہ کچھ سہم سی گئی۔ آس پاس دیکھا فرزانہ بھی نہیں تھی۔ بیگم جہانگیر بھی شاید
کہیں اور نکل گئی تھیں۔

”آئندہ میں تمہیں اس لڑکے کیساتھ نہ دیکھوں۔“ اسکی آنکھیں چنگاریاں اگل رہی تھیں۔

”وہ... وہ میرا کولیگ ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔ لیکن دوبارہ وہ تمہارے پاس بھی پھٹکا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”آپ... آپ میرے معاملات میں کیوں بولتے ہیں۔“

”میں... میں... تمہارا لگہ دباؤ ننگا کسی دن۔“ اس کی آواز نیچی تھی۔ مگر بلا کا غضب تھا

لب و لہجے میں۔

”آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے۔“ وہ سنبھل گئی تھی، طنزیہ لہجے میں بولی۔

”میں حق لیا نہیں کرتا۔ استعمال کرتا ہوں۔“ اسکی بات میں چٹان کی سی مضبوطی تھی۔

بڑے بڑے قدم اٹھاتا وہ آگے بڑھ گیا۔

اور دھنک مفلوج ساز ہن لئے خالی خالی نظروں سے دیوار پر آویزاں تصویر کو دیکھنے لگی۔

کتنا وقت گزر گیا وہ وہیں دیوار سے نگی سوچوں میں گم کھڑی تھی۔

”دھنک مبارک ہو تمہاری پینٹنگ دوسرے نمبر پر آئی ہے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے۔“

ڈیزیز زندہ اور ماحول جیتا جاگتا لگ رہا ہے اور یہی ایک تصویر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔“

دھنک سوچوں سے ابھر آئی۔

”سچ کہتی ہو؟“

”تو اور کیا۔ تم اس طرف تو آؤ۔ یہاں چپک کر رہ گئی ہو۔ اپنی تصویر کے چہرے تو سنو۔“

فرزانہ اور دھنک کچھ دیر اور وہاں رہیں اور پھر بمعہ آصف کے تینوں واپس لوٹ آئے۔

فرزانہ اور دھنک بس سے اور آصف اپنی بائیک پر۔

فخر عالم کیا اپنی شادی سے مطمئن نہیں تھا؟ اس کی بیوی امیریکہ اور وہ یہاں تھا۔ پھر بیگم

جہانگیر بھی موقع سے فائدہ اٹھاتی نظر آتی تھیں۔ مگر۔

سو ساری
ڈاکٹ
کام

میں رپورٹر ہوں۔ آپ کے اور آپ کے پھولوں کے متعلق لکھنا چاہتی ہوں۔
 ”اچھا اچھا“۔ وہ بہت خوش ہوا۔ ”مگر بیٹی آج تو تمہیں یہاں کسی بھی دکان پر پھول
 نظر نہیں آئیں گے۔“

”کیوں؟“ وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

”شہر کے رئیس فخر عالم صاحب کی سالگرہ ہے۔ شہر کی تمام دکانوں سے پھول آرڈر پر
 منگوائے ہیں۔“
 ”اوہ۔“

اور اسے بہت کچھ یاد آیا۔ پہاڑ پر اسکی سالگرہ، مسکور کن باتیں، بحر زدہ ماحول اور صرف
 وہ دونوں!

آج شاید اسکی سالگرہ زور شور سے منائی جا رہی تھی۔ شاید فریڈہ واپس آگئی تھی اور یہ
 اسکی خواہش پر ہو رہا تھا۔ یا پھر وہ مناتا ہی اسی طور تھا اپنی سالگرہ۔ بہر حال۔
 آج وہ پھولوں کی ان گنت دکانوں میں سے پھولوں کے ڈھیر اٹھالے گیا تھا۔
 مہک رہا ہوگا اسکا ہال۔ اور۔

اس نے سر جھٹکا۔ وہ تلخ یادوں کو یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”اچھا بابا۔ آپ مجھے پھولوں کے بارے میں کچھ بتائیے۔“ اس نے اپنی نوٹ بک
 کھولی۔

”بیٹی! پھول بڑے پیمانے پر ملک کے خاص حصوں مثلاً حیدرآباد وغیرہ سے آتے ہیں۔
 وہاں بڑے بڑے بیوپاری اس کام سے وابستہ ہیں۔ حیدرآباد کے آس پاس اور اندرونی
 سندھ کے گاؤں میں پھولوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ یہاں لمبے چڑے علاقے پر پھیلے
 ہوئے فارموں پر کئی من چنبیلی، موتیا، گیندا اور دیگر قسموں کے پھولوں کی کاشت ہوتی ہے۔
 یہ پھول صرف زیورات کیلئے ہی نہیں بلکہ انہیں خوشبو یا تیل بنانے کیلئے استعمال کیا
 جاتا ہے۔ ملک سے باہر بھی بھیجا جاتا ہے۔ اس استعمال کے بعد جو پھول بچ جاتے ہیں انہیں

دن دیرے دیرے کھسک رہے تھے۔ دھوپ کی چھین میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔
 لمبے لمبے دن کا شادو بھر ہو گیا تھا۔

آج اس نے گل فروشوں کی طرف جانا تھا۔

آصف کسی ضروری کام میں مصروف تھا۔ اسلئے فونو گرائی بھی اسکے ذمے لگا رکھی تھی سو۔
 وہ اکیلی ہی اس طرف چل پڑی۔

گندم کی کٹائی جاری تھی۔ کہیں کٹ چکی تھی، کہیں گھٹوں کی شکل میں پڑی تھی، کہیں اب
 بھی سنہری بالیاں لہرا رہی تھیں۔

بس کی کھڑکی میں سے باہر نظریں جمائے وہ چلی جا رہی تھی۔

گل فروشوں کی دکانوں سے وہ پہلے بھی اکثر گزر چکی تھی۔ یہاں پھولوں کے ڈھیر ذہن کو
 معطر کر دیتے تھے۔ کلیوں اور پھولوں سے بنے سہرے مہکتے تھے۔ ایک طرف گجرے اور کنگن
 لٹکے نظر آتے تھے۔ کئی لوگ چابکدستی سے پھول پروانے میں مصروف نظر آتے تھے۔ رنگ
 برنگے گلہ سے بنتے تھے۔ اور یہ سب چیزیں مختلف مواقع پر استعمال ہوتی تھیں۔

وہاں پہنچی تو۔۔۔ دکان خالی خالی سے نظر آئے۔

ایک سے دوسری اور پھر تیسری دکان میں گئی۔

”بابا۔ آج دکانیں خالی نظر آ رہی ہیں کیا بات ہے۔“ وہ وہیں بوڑھے گل فروش کے
 پاس بیٹھ گئی۔

”کیوں بیٹی کیا چیز چاہیے؟“

”کچھ نہیں بابا۔ میں پریس والوں کی طرف سے آئی ہوں۔ میں ایک رسالے کے دفتر

نگلی تو نظرامی کے خط پر پڑی۔ اٹھا کر وہ ساتھ اندر لے گئی۔ فرزانہ آچکی تھی۔ کھانا گرم کر دی تھی۔ اس نے بھی کپڑے بدلے اور خط لے کر کھانے کی میز پر آ بیٹھی۔ خط کھولا۔ وہی ہر سال کی طرح چند دن کی چھٹی لیکر پہاڑ پر آ جانے کی دعوت! دل ٹھنڈا، ہریالی اور سرسبز پہاڑوں کیساتھ اچھلا تو ضرور مگر۔ پھر وہی فخر عالم سے بڑبھیڑ کا خدشہ!

اور کھانے کے بعد اس نے امی کو لکھ دیا وہ اس شرط پر جائیگی کہ اس بار وہ پہاڑ کے کسی اور گاؤں جا کر قیام کریں۔ بہت دیکھ چکے تھے اس گاؤں کو۔ امی ابو کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ نہ سہی پاس والا گاؤں سہی۔ ماحول تو وہ ہی تھا۔ فوراً نیلم کا جواب آ پہنچا۔ امی کو اسکی شرط منظور تھی۔ اس نے بھی دس دن کی چھٹی کی درخواست دے ڈالی۔ کہ شاید یوں ہی کچھ من بہل جائے۔ اس ماحول سے دور رہ کر۔ اس شام دھعر سے پرے جا کر!

ٹھیکیدار کو بیچ دیا جاتا ہے۔ پھر یہ ٹھیکیدار ان پھولوں کو مقامی گل فروشوں کو بیچ دیتے ہیں۔“
”بابا آپ نے کب سے یہ کام شروع کیا ہے؟“
”بیٹی میں گل فروش کے اس کاروبار میں تیسری نسل ہوں۔ میرے باپ دادا بھی پھول بیچتے تھے۔ پھولوں کے زیور بنانے کا فن مجھے ورثے میں ملا ہے۔“
کچھ اور بھی پوائنٹس لیکر اس نے بوڑھے گل فروش اور اسکی خالی ہی دکان کی تصویریں بھی اتاریں اور پھر۔

اس سے اجازت طلب کرتے ہوئے گھر لوٹ آئی۔
فرزانہ کیساتھ کھانا کھاتے ہوئے آج ایک بار پھر وہ اداس تھی۔ ابھی اسکی آزمائشوں کا سلسلہ جاری تھا۔ بھول کیوں نہیں پاتی تھی اسے؟
لیکن۔ وہ تو کوشش کرتی تھی۔ فخر عالم یا اسکا ذکر ہی آ نکلتا تھا کہیں نہ کہیں سے۔
اچانک اسکا دل چاہا نکل بھاگے یہاں سے۔
دور جہاں نہ فخر عالم ہو نہ اسکا ذکر!

پر۔ کہاں؟
اپنا پروفیشن بھی تو اسے عزیز تھا!
گھر والوں کی ہزار مخالفتوں کے باوجود وہ اس لائین میں آئی تھی۔ کیا پتہ تھا حالات یوں کروٹ بدلیں گے۔ وہ زندگی تک سے اکتا جائیگی۔
کیا باہر نکلتا ہی چھوڑ دے؟ مگر کب تک؟ اور پھر آفس سے نکل کر جس بس سٹاپ پر وہ بس کا انتظار کرتی تھی پہلے نہ سہی اب تو وہ اکثر و بیشتر اسی طرف سے گزرنے لگا تھا۔ اور اگر وہ ایسا نہ بھی کرتا تو آصف کیا کم تھا اسکا تذکرہ لے بیٹھنے کیلئے!

آج وہ آفس میں بھی کم سم تھی۔ کہ زندگی جیسے عذاب بن کر رہ گئی تھی، جینا دو بھر ہو گیا تھا!
مارے دن کی جھک جھک کے بعد جب وہ تھکے تھکے قدموں سے فلیٹ کے اندر گھسنے

آج بھی وہ میل بھر پر پٹک منانے گئے تھے۔ سڑک کے کنارے گاڑی لگا کر وہ لوگ کھانے پینے کی چیزیں اٹھا کر اوپر درختوں کے جھنڈ میں جا بیٹھے تھے۔ کچھ دیر کارڈز وغیرہ کھیلتے رہے۔ پھر پچھلی جانب ڈھلان، کھائی اور کھائی میں بھری کھرا نظارہ کرتے رہے۔ تصاویر اتاریں۔

پھر واپس آ کر کھانا کھانے لگے۔ کہ وقت بھی تھا اور کھانا ٹھنڈا ہو جانے کا خدشہ بھی! مٹر پلاؤ، بھنا قیمہ اور پراٹھے۔ حرا آ گیا!

کھانے کے بعد سب نے تھرمس سے گرم گرم چائے پیالیوں میں لی۔ امی اب تو ایک طرف جا کر بیٹھ گئے، نیلم اور دھنک عین سڑک کے اوپر آسنے سامنے درختوں سے لپک لگا کر ٹانگیں سیدھی پھیلاتے ہوئے بیٹھ گئیں تاکہ سڑک کیساتھ ساتھ سڑک کے اس پار ڈھلان پر یہاں وہاں بنے مقامی لوگوں کے چھوٹے چھوٹے گھروندے اور انکار بن بہن بھی دیکھ سکیں۔

ڈھلان پر نظریں جمائے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پی رہی تھی۔ تبھی سامنے والے موڑ پر ہلکے سے ہارن سے محویت ٹوٹی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس طرف دیکھنے لگی۔ موڑ کاٹتے ہوئے ایک جیب سامنے آئی اور۔ جس شخص سے فرار ڈھونڈتی وہ یہاں تک آئی تھی۔ وہ آہستہ رفتار سے جیب چلاتا چلا آ رہا تھا۔

پھر دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر صرف وہ ہی نہیں جیسے وہ بھی بے قرار ہوا تھا۔ پرکشش چہرے پر سائے سے لہرائے تھے۔ دلنشین آنکھیں کھائیل سی لگنے لگی تھیں۔ اور پھر جیسے۔ بے قراری کی جگہ غصہ نے لے لی۔ چہرے کے سالیوں کی جگہ بیزاری نظر آنے لگی۔ کھائیل آنکھوں میں وحشت اترنے لگی۔

کیوں تھا ایسا؟ کیا وہ ابھی تک فریدہ سے ایڈ جسٹ نہیں کر پایا تھا؟

وہ اب بھی جیسے اسے چاہتا تھا۔ اسکا پہلا انداز یہی کہہ رہا تھا۔ بعد میں ان جذبوں کی جگہ غصے اور وحشت نے لے لی تھی۔ جیسے اس پر غصہ آ رہا ہو۔ بہر حال۔

یہ جگہ اس گاؤں سے پانچ میل کی دوری پر تھی۔ قدرے بڑا قصبہ تھا۔ ڈپنری، پبلک کال آفس اور اچھی قسم کے دو ایک ہوٹل بھی تھے۔ بل کھاتی سڑک پر آتی جاتی گاڑیاں، بازار قدرے بڑا اور ضرورت کی ہر چیز میسر تھی۔ ٹورسٹ بھی اسی نسبت سے زیادہ تھے اور رونق بھی۔ انہوں نے ایک اچھا سا سوٹ اوپر اونچائی پر پورے سیزن کیلئے لے لیا تھا۔ خوشی خوشی سامان لگایا۔ تب تک امی کھانا تیار کر چکی تھیں۔ کھانا کھا کر نیلم اور دھنک دونوں باہر آمدے میں کرسیوں پر بیٹھ کر چاروں اطراف کا نظارہ کرنے لگیں۔

”ہاتھی۔ یہ جگہ واقعی اس سے اچھی ہے۔“ نیلم شال اچھی طرح کندھوں پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

”اسی لئے تو میں نے لکھا تھا۔ بس ایک ہی جگہ بار بار جاؤ بوری ہو جاتا ہے بندہ۔“ جبکہ۔ وہ چھوٹا سا گاؤں اسے اب نہیں برسوں سے پیارا تھا۔ نہ زیادہ ٹورسٹس کا شور، نہ سڑک پر گاڑیوں کے دھوئیں، اور پھر بڑے ہوٹل نہیں بھی تھے تو کام چل سکتا تھا۔ بھلے پبلک کال آفس نہ تھی۔ ایک خستہ حال ٹیلیفون ایکس چینج تو تھا۔ سب سے بڑھ کر ایک سکون تھا۔ گہرا سکون!

مگر۔ اسکی قسمت میں سکون کہاں تھا؟

اب تو وہ ہفتہ بھر اس قصبے میں چینج ڈھونڈنے آئی تھی۔ ٹھنڈ تو تھی کم از کم۔ شہر کی طرح جھلسا دینے والی گرمی تو نہ تھی۔

دن اچھے برے گزر رہے تھے۔ وہ اپنے آپکو نیلم امی اور ابو کیساتھ مصروف رکھتی۔ کبھی کھانا پکاتی کبھی دوسرے کاموں میں ہاتھ بٹاتی کبھی سب کیساتھ پٹک پر نکل جاتی۔

بانہوں میں لے لیا۔

”کل دوپہر کا کھانا تم نے میرے ساتھ کھانا ہے۔“ آنٹی نور جہان کی آواز اسکے

کانوں میں پڑی۔

اس نے سر اور بھی بانہوں میں بھینچ لیا۔ امی نے یقیناً حامی بھر لینی تھی اور وہ۔

فخر عالم کے اس قدر قریب نہ جاسکتی تھی۔ اس علاقے میں قدم قدم پر اسے وہ ہی نظر آتا

تھا۔ بھول جانا چاہتی تھی وہ اسے۔ بھاگ جانا چاہتی تھی کہیں۔

ایسی جگہ۔ جہاں نہ فخر عالم ہونہ اسکی موجودگی کی توقع اور نہ ہی اسکا ذکر!

”کھانے کا تکلف کیوں کرتی ہو ویسے بھی آئیے۔ کوئی غیر تو ہیں نہیں ہم۔“ امی کی

آواز جیسے دور سے آرہی تھی۔

”تم بھی ضرور آنا بیٹی۔ یہ لوگ تو آ ہی جاتے ہیں تمہارا ہاتھ لگنا مشکل ہوتا ہے۔“ وہ

یقیناً اس سے مخاطب تھیں۔

اس نے بانہیں کھول لیں۔ سر میں اب بھی ہلچل تھی۔ چہرہ کھلایا کھلایا۔

تھکی تھکی نظریں اٹھا کر وہ آنٹی کی طرف دیکھنے لگی۔

”آنٹی۔ آپ میری طرف سے معذرت قبول کر لیں۔ میں پھر کبھی آؤں گی۔“ اسکا لہجہ

بھی تھکا ہارا تھا۔

”تو پھر پہاڑ پر آؤ گی اور پھر میرے یہاں آؤ گی۔ یعنی پورے ایک سال بعد۔ تا بابا۔

کل ہی آنا پڑیگا۔ ویسے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ وہ خود ہی اپنے آگے میز پر لگی چائے

اس کیلئے پیالی میں نکالنے لگیں۔ ”لو گرم گرم پی لو۔ طبیعت ٹھیک ہو جائیگی۔ اور ہاں۔ آنا ضرور

ہے۔ میں انتظار کروں گی۔“

اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے حامی بھرنا پڑی۔ اسکے دل میں آنٹی نور جہان کیلئے خاص

جگہ تھی۔ زیادہ انکار کی گنجائش نہ بنا پائی۔

”باجی۔ یہ آدمی جانتا تھا آکھو؟“ نیلم کو ایسا ہی لگا۔

”معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے جانتا ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی شخص کو جانتے ہیں اس

نے ہمیں دیکھا تک نہیں ہوتا۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ وہ شخص تو ہمیں اچھی طرح جانتا ہے

ہم ہی نا واقف ہوتے ہیں۔ صحافت کا پروفیشن ہی ایسا ہے۔“ اس نے بات بنائی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ نیلم خالی کپ ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

اور۔ دھنک نے سوچا یہاں سے وہ کہاں چلی جائے؟

دوپہر کو قدرے آرام کرنے کے بعد وہ اٹھی منہ ہاتھ دھو کر امی کی طرف آئی تو دیکھا آنٹی

نور جہان آئی بیٹھی تھیں۔ فخر عالم کی دریا پار پڑوسن!

”بڑا ہی نیک شخص ہے۔ اتنے جنگلات اتنی املاک ہیں کہ گنتے تھک جاؤ مگر ذرا بھی

جو غرور ذرا بھی جو بڑائی ہو اس آدمی میں۔“

جانے کس کی بات کر رہی تھیں وہ؟

”السلام علیکم آنٹی۔“ وہ اندر داخل ہو کر انہیں گلے ملی۔

”جیتی رہو بیٹی۔ انہوں نے اسے ماتھے پر پیار کیا۔ ”خوش ہو آؤ بیٹھو۔“

وہ اگلے قریب بیٹھ گئی۔

”کس کی باتیں ہو رہی تھیں؟“ اس نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”ارے وہ ہمارے مشرقی طرف والے سینڈھ کی۔ اسکے مالی کی بیٹی میرے سکول میں داخل

ہوئی ہے۔ بہت تعریف کرتی ہے۔ اس وقت بات سے بات نکلی تو زبان پر ذکر آ گیا۔ تمہاری

امی نے کامران کی بات بتائی تو خیال آیا ہر بڑا آدمی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ بعض دولت والے

چھچھورے ہوتے ہیں اور بعض اعلیٰ ظرف کے حامل۔“

اور۔ دھنک سوچنے لگی۔ یہ آدمی ہم میں سے ہر ایک کے حواس پر کیوں چھا گیا ہے؟

اسکی کپٹیاں جلنے سی لگیں۔ سر کے اندر جیسے شور سا ہونے لگا۔

اور پھر اس نے وہیں کونے میں بستر پر لیٹ کر سر کے اندر کی ہلچل کم کرنے کے

"بیٹے تم نہیں جاؤ ہمارے ساتھ۔ ابھی بھی بخار ہے۔ ماتھاپ رہا ہے۔ چلی گئیں تو اور طبیعت خراب ہوگی۔ ہم بس جلدی ہی آجائیں گے۔ اب وعدہ کیا ہے تو برا لگتا ہے۔ تمہاری طرف سے معذرت کر لوں گی۔ اور ہاں تمہیں ٹھنڈی ہی ملے گی ہے..."

وہ آگے بڑھ کر الماری میں دوائی تلاش کرنے لگیں۔ پھر پکن سے گرم دودھ گھاس میں لائیں۔

"اشو بیٹا"۔ انہوں نے اسے سہارا دیا۔ "یہ کھالو۔ صرف بخارا تارنوالی دوا سے میرا خیال نہیں کہ تم ٹھیک ہو جاؤ یہ بھی ساتھ لے لو"۔ انہوں نے اسے ایک کپھول کھلا دیا۔

اسنے بچوں کو پالا پوسا بڑا کیا تھا۔ چند ضروری اور فوری طور پر دینے والی دواؤں کا استعمال تو وہ بھی جانتی تھیں۔

اسے لحاف اچھی طرح اوڑھا کر کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے وہ باہر نکلنے لگیں۔

"بس کھانا کھاتے ہی چل پڑینگے"۔ امی ٹکر مندی بولیں۔

"امی آپ فکر مت کریں۔ ٹھنڈی تو لگی ہے۔ دوائی سے ٹھیک ہو جائیگا سب"۔ اس نے امی کو تسلی دی۔

کچھ دیر یوں ہی بستر میں تھکی رہی۔ بخار پھر سے چڑھنے لگا تھا۔ اٹھ کر اس نے ایک بار پھر گولیاں لیں۔ پھر بستر میں لیٹی۔

تھکی تھوڑی دیر بعد اسے پسینہ آنے لگا۔ طبیعت ہلکی محسوس ہونے لگی۔

اٹھ آئی بستر سے۔ الجھن ہو رہی تھی پڑے پڑے۔

منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ سرسری سے بال درست کئے، گلجے کپڑوں پر ایک نظر ڈالی اور تھکی تھکی ہی کمرے سے باہر نکل آئی۔

برآمدے میں سے سامنے دیکھا سرسبز ڈھلان، پھر سڑک، اور سڑک کے کنارے دکانیں، لوگوں کی گہما گہمی۔

ڈھلان کی چمکند ٹی پر دیرے دیرے چلتی وہ نیچے اتر گئی۔ اپنی رو میں وہ گہما گہمی سے

رات بھر وہ کروٹ پر کروٹ بدلتی رہی۔ سر بخاری ہو رہا تھا۔ جسم میں سخت درد۔ شاید اسے بخار ہو گیا تھا۔

جوں جوں کر کے صبح ہوئی۔ اسکی نبض تیز تھی۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ غالٹا ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ اٹھتے ہوئے وہ ہاتھ روم گئی۔ منہ ہاتھ دھوئے۔ پکن میں گئی۔ سب میز کے گرد بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

اس نے بھی گرم چائے کا کپ لیا۔

"ناشتہ کیوں نہیں کرتیں بیٹا"۔ امی بولیں۔

"امی سر میں بہت درد ہے۔ ناشتہ کو دل نہیں کر رہا"۔

"کیا بات ہے بیٹا۔ ٹھیک تو ہوتا"۔ ابو نے اسکے کھلائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

ساتھ ہی اسکی نبض تمام لی۔ تمہیں تو بخار ہے"۔ وہ تشویش سے بولے۔

"ہاں لگتا ہے ابو مگر ٹھیک ہو جائیگا۔ مجھے لگتا ہے ٹھنڈ لگ گئی ہے"۔ اسکالاب دلجو بھی تھا۔

تھا ساتھ۔

"ناشتہ میں کچھ لے لو اور بخار کی گولیاں کھالو"۔ ابو نے کہا۔

"جی اچھا ابو"۔

دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے لائیٹ سا ناشتہ کیا۔ گولیاں لیں۔ سب کیساتھ بیٹنے کی کوشش کی۔ مگر سخت تھکی تھکی سی تھی۔ دوبارہ آکر بستر میں لیٹ گئی۔

بارہ بجے امی ابو اور فیلم آنی نور جہان کے یہاں جانے کیلئے تیار ہو رہے تھے۔

امی اسکے پاس آئیں۔ اسکا ماتھا چھوا اب بھی گرم ہو رہا تھا۔ اسکی سانسیں تیز چل رہی

تھیں۔

READING
Section

”ہاں“۔ وہ تھکی تھکی سی بولی۔

”تو پھر اتنی بارش میں گھومنے کا شوق کیوں چرایا۔“

اسکے لب و لہجے میں اسکے لئے کیر تھی، Concern تھا۔

صدیوں بعد جیسے اسکی باتیں اسکے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔

”بستر میں پڑے پڑے طبیعت گھبرانے لگی تھی۔“

”کب سے بخار ہے۔“ اس نے بلا جھجک اسکی نبض دیکھنے اسکا ہاتھ تھام لیا۔

دھنک نے دھیرے سے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ کہ یہ رشتہ اب اسکا فریڈہ کیساتھ ہونا

چاہئے تھا۔

”شاید کل سے۔“ وہ مختصر ا بولی۔

”اس بار یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟“ پہلے جو اسکی اسٹیٹ کے پاس والے گاؤں میں

آکر قیام کیا کرتے تھے۔“

”بس۔“ اسکے لہجے میں اداسی عود کر آئی۔

”کتنے دن کیلئے آئے ہو۔“

”امی ابو پورا سیزن گزارینگے میں دو دن بعد چلی جاؤنگی۔“

”اگر تمہارا بخار اترتا تو۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولے جا رہا تھا۔

وہ مسکرا دی۔

”نہ بھی اترتا تو۔“

”کیوں؟“

”ڈیوٹی ڈیوٹی ہے۔“

”Oh, I see...“

گھر قریب آچکا تھا۔

”تھینک یو دیری مچ۔“ وہ اترنے لگی۔

مخالف سمت چل دی۔

ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی۔ کہ ٹپ ٹپ بوندیں پڑنے لگیں۔ اسے احساس ہوا یوں بخار

کی حالت میں یہاں تک آکر اس نے اچھا نہیں کیا۔ اور پھر اوپر سے بارش جو لمحوں میں ہی

تیز شکل اختیار کر گئی تھی۔

تبھی وہ چونکی کسی نے جیب اسکے قریب روکی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے بارش

سے بچانے کی خاطر اندر آنے کو کہہ رہا تھا۔

”آؤ۔ بھگ رہی ہو۔ میں پہنچا دوں گا۔“ خلاف توقع اور جیسے مدتوں بعد اس میں اسے

پرانا فخر عالم نظر آیا۔

”تھینک یو۔ میں چلی جاؤنگی۔“ بخار کی حدت سے اس کی شرتی آنکھوں میں سرخ

ڈورے بہت واضح ہو رہے تھے۔ اور خود وہ نڈھال سی لگ رہی تھی۔

اسکی حالت دیکھ کر فخر عالم کو پہلے کی طرح غصہ نہیں آیا۔

”آؤ۔ تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

اس نرم رویے پر جانے کیسے وہ مزید انکار نہ کر سکی۔ اور شاید یہ بھی تھا کہ بخار ہونے کی

وجہ سے وہ اپنے میں اتنی بارش میں گھر پہنچنے کی ہمت بھی نہیں پار ہی تھی۔

کچھ کہے بغیر ہی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ فخر عالم نے دروازہ بند کر دیا۔

گاڑی واپس موڑ کر سامنے دیکھتے ہوئے ڈرائیو کرنے لگا۔ اسے شاید معلوم تھا کہ وہ

لوگ مخالف سمت میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

”کیسی ہو؟“ وہ اب بھی سامنے دیکھ رہا تھا۔ عرصے بعد نرمی برت رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے نقاہت سے سر سیٹ کی بیک سے

نکادیا۔

”Looks to me like you have fever.“ ایک نظر اسکے بچکے

کپڑوں پر ڈالتے ہوئے وہ پھر سامنے دیکھنے لگا۔

”Take care of your self.” وہ دھیرے سے بولا۔
 اور۔۔ دھنک نے سوچا اُسے کیوں اب بھی اسکا خیال تھا؟ پرواہ تھی؟
 کاش ایسا نہ ہوتا۔ پھر شاید وہ بھی اس کیلئے اتنی بے قرار نہ رہتی۔
 بات شاید دونوں طرف اسی طرح تازہ تھی جیسے کچھ عرصہ قبل تھی۔ جیسی تو باوجود کوشش کے
 وہ اسے بھول نہیں پارہی تھی۔
 آج وہ معمول سے ہٹ کر اس سے نرمی سے خوشگوار سے پیش آیا تھا۔ اور اسکا یہی
 رویہ ساری رات بخار کیساتھ ساتھ اسے مزید تڑپاتا رہا۔

کل اس نے واپس جانا تھا۔ اسکا بخار اب بھی ٹوٹا نہیں تھا۔ کمزوری اب بھی اپنی جگہ تھی۔
 مگر ڈیوٹی بھی ڈیوٹی تھی۔ کام کا حرج ہو رہا تھا۔
 ہاں اس وقت بخار کیلئے دوا لینے سے فرق ضرور آ گیا تھا۔ جسم ہلکا اور طبیعت کا جو مصل پن
 جاتا رہا تھا۔

دن کے دس بج چکے تھے۔ اس نے بلو پرنٹڈ پیارے سے کپڑے پہنے۔ آف و ایمپٹ جیکٹ
 اور سفید جوگرز پہنے خوبصورت بالوں پر برش کیا اور۔۔
 گھر کے سامنے والی سرسبز ڈھلان کی پگڈنڈی پر نیچے اترنے لگی۔
 ”امی میں ذرا اپنے آفس فون کرنے جا رہی ہوں۔“

امی وہیں ڈھلان پر گھاس پر رکھی کرسی پر بیٹھیں دوپہر کھانے کیلئے سبزی کاٹ رہی تھیں۔
 ”جاؤ بیٹا۔“ وہ اسکے حسین سراپے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولیں۔ بخار نے اسے کافی
 کمزور کر دیا تھا۔

وہ پبلک کال آفس میں ڈیوٹی پر بیٹھے آپریٹر کو اپنے آفس کا نمبر دیکر ایک طرف ہو کر
 کھڑی ہو گئی۔

”اے بیٹی! قوس قزح ہی ہونا۔“

جانی پہچانی سی آواز کان میں پڑی تو وہ چونک اٹھی۔

بھلے اسے دھنک سے قوس قزح بنا دیا تھا۔ پر تمہیں وہی فخر عالم کی ماما۔ پاس کھڑیں چشمہ
 درست کرتیں اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔
 پہلی بار انہیں ہل شیشین پر دیکھا تھا۔

"ماما آپ"۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔
 "ہاں بیٹی میں"۔ ہاتھ میں پکڑی نوکری بچے فرش پر رکھتے ہوئے وہ اسے گلے لگا کر بار بار اسکا ہاتھ چوم رہی تھی۔
 "مہرے کہاں رہ گئی تھی۔ کہاں کہاں تمہیں چکے چکے ڈھونڈتی رہی۔ خدا یا شکر ہے تیرا میری بیٹی مجھے مل گئی"۔ وہ آنکھوں میں آئے آنسو پلو سے پونپنے لگیں۔
 "ماما بیٹیس پلیز!" اس نے انہیں وہیں ایک کرسی پر بٹھایا۔ "آپ ٹھیک تو رہیں اتنا عرصہ یہاں آکھو پکلی بار دیکھا ہے۔ کیسے آنا ہوا آپ تو وہیں شہزادی کوٹھی میں ہوا کرتی تھیں..."
 "ٹھیک ہی رہی بیٹا۔ اور یہاں تو اسلئے آئی ہوں کہ فخر عالم لہا کیلا ہوتا ہے۔ کیسا دکھی ہے میرا بچا کیلانہ کچھ سکی۔ ضد کر کے ساتھ چلی آئی۔ اب تو جہاں وہ ہوگا وہاں میں ہوگی بس..."
 "میزم بات کریں۔ رنگ جا رہی ہے"۔ آپرٹر دھنگ سے مخاطب ہوا۔
 "بات کر کے سا بھی آئی ماما"۔ وہ اس طرف بڑھی۔
 "تھوڑی سی دیر میں بات کر کے وہ دوبارہ اٹکے پاس آگئی۔
 "آئیں ملہ کھٹے چلے ہیں آپ اپنا کام بھی کر لیں گی اور باتیں بھی ہوتی رہیں گی"۔
 "ہاں ہاں"۔ انہوں نے جلدی سے نوکری اٹھالی۔
 "دھنگ نے انہیں میز می اترنے میں مدد دی۔
 "زیادہ کام نہیں ہے بس کچے اخروٹ لینے تھے۔ بہت اچھا ہوتا ہے اسکا تیل۔ ماش کہو گی اپنے بچے کے سر میں۔ پر جاناں مارے دے بری ہیں دشمنوں کو۔ دو ایک دن سے تو اور بھی باڈا اچھا ہوا ہے۔ کھانا پرائے نام رہ گیا ہے۔ کہتا ہے تھوڑا کھانا اچھا ہوتا ہے۔ فٹ رہتا ہے بند۔ پتہ ہے مجھے سب مجھے بہلانے کو کہتا ہے..."
 وہ اگلے ساتھ دکان میں گئی۔ انہوں نے امیر سارے کچے تازہ تازہ اخروٹ خریدے۔
 انہوں سے انہوں آگے بڑھ گئیں۔

"بیٹی۔ فخر عالم بہت اکیلا ہے۔ اسے اپنالو۔ اسکا دکھ بانٹ لو..."
 "ماما فریڈ وہ امیر کچے سے واپس کیوں نہیں آجاتیں؟"
 "ارے گم کرو اسے۔ گند ہمتا دور رہتا پھرتا ہے۔"
 "مگر وہ فخر عالم صاحب کی بیوی تو ہیں نا..."
 "کیا؟" وہ وہیں بیچ راستہ میں رک گئیں۔ "کیا مطلب؟"
 "ماما آپ کہتی ہیں میں انہیں اپنالوں... تو... ایک بیوی کی موجودگی میں یہ سب کیسے ممکن ہے؟"
 "ارے بیٹی کا ہے کی بیوی؟ اسکی شادی ہی کب ہوئی ہے؟"
 "کیا؟"

"یہ ضرور ہے کہ ساری باتیں فریڈ پر ثابت ہوگی جس میں اس نے ایک ایک بات کا اقرار کر لیا تھا۔ گاڑی کے بریک اسی نے ٹپل کروائے تھے۔ اسی طرح سکیٹنگ میں دھکا بھی اسی نے کسی آدمی سے دلوایا تھا۔ یہی بات دوہرائی میں بھی ثابت ہوئی تھی مگر فخر عالم نے اسکی ہر بات معاف کر دی۔ کہتا تھا کچھ بھی ہو خالہ زلہ ہے اور ہر جگہ جگہ باتوں کے چرچے ہوتے۔ ہاں شادی سے صاف انکار کر دیا"۔
 دھنگ ششدری کھڑی سن رہی تھی۔
 "لیکن۔ وہ تو ہمارے گھر آئی تھی اتنی دور۔ یہ بتانے کہ میں انکی شادی میں رکاوٹ بن رہی ہوں ورنہ کبھی کی ان دونوں کی شادی ہو چکی ہوتی اور یہ بھی کہ اگلے بنتے انکی شادی ہو رہی ہے..."
 "سب جھوٹ بولا ہے۔ کوشش میں ضرور لگی تھی کہ ہو جائے رخصتی مگر۔ جب گولیوں کی رپورٹ آگئی اور ثابت ہو گیا کہ زہر ملی تھی۔ سب غم ہو گیا۔
 زہر ملی گولیوں اور ہاتی سب باتوں کے اقرار کے بعد دن رات رونا کر فخر عالم سے معافیاں مانگتی تھی۔ رخصتی کا کہتی تھی۔ فخر عالم سخت پریشان تھا۔ یہ انہی دنوں تمہارے گھر گئی

READING
Section

"ماما۔ جب میں آخری بار آپ لوگوں کے یہاں آئی تھی۔ اور وہ دوائی والی بات ہوئی تھی۔ اسکے بعد جب میں اپنے فلیٹ پر گئی۔ تمام حالات کا بغور جائزہ لیا۔ تو میں گھبرا گئی۔ مجھے فخر عالم صاحب سے مزید تعلق رکھنا بہت مشکل بلکہ ممکن سا لگنے لگا۔ انکا نکاح ہو چکا فریدہ قانونا ناانگی بیوی تھی۔ پھر مجھے لگا۔ کچھ ہاتھ فخر عالم صاحب کا اسکو پسند کرنے میں یہ بھی تھا۔ میں ان دونوں کے بیچ آگئی تھی۔ یہ سوچ کر مجھے اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا۔ اور پھر اچانک۔۔۔

ایسے لگا جیسے میرے ارد گرد جال سے بندھنے لگے تھے۔ اور میں ان میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ اپنا راستہ کھو بیٹھی تھی۔ فخر عالم صاحب شادی شدہ تھے۔ انکے گھر بے مسائل بہت اچھے ہوئے تھے۔ پھر ایک طرف فریدہ تھی۔ انکے گھر کی بھی۔ دوسری طرف میں ایک ڈال کلاس بڑی۔ ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

یہی سب سوچ کر میں نے چھٹی لے لی۔ گھر چلی گئی۔

یہاں مجھے اپنے اور فخر عالم صاحب کے درمیان اور بھی قاصدے لے کر آنے لگے۔ اتنے۔ کہ جنہیں عبور کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔

میں مانتی ہوں میں انہیں بہت مشکل وقت میں چھوڑ کر گئی تھی۔ مجھے اپنا آپ خود غرض بھی لگا تھا مگر۔ ان حالات کا سامنا کرنا بھی مجھے ممکن نظر آ رہا تھا۔

انکا نکاح نہ ہوا ہوتا۔ تب بھی کوئی بات تھی۔ تب میں شاید ہر مشکل کا مقابلہ کر لیتی۔ لیکن فریدہ پہلے سے انکی منکوحہ تھی۔ یہ سوچ کر مجھے اپنا آپ بوز بھی خود غرض لگنے لگا۔ بس۔

میں فخر عالم صاحب کو بتائے بغیر ہی گھر چلی گئی۔ انہوں نے وہاں فون کیا۔ تو میں نے اسیجہ فون کرنے سے منع کر دیا۔ پھر انکا خط آیا۔ میں نے اسکا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔" اسکی خوبصورت آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"ماما میں نے بڑی مشکل سے دل کو سمجھایا تھا۔۔۔ کہ اتنے میں فریدہ آگئی۔ بیوی۔ تم

ہوگی۔ تمہیں اپنے راستے سے ہٹ جانے کو کہا ہوگا۔ بہر حال۔ فخر عالم نے اس سے دونوک بات کر لی۔ طلاق بھی دیدی۔ کہا میری طرف سے آزاد ہو۔ جس سے چاہو شادی کر سکتی ہو۔ پھر وہ امریکہ چلی گئی۔ اب سنا ہے وہیں اپنے ایک پرانے ہائے فیٹڈ سے شادی کر لی ہے۔۔۔" ہائے فیٹڈ سے یقیناً ماما کی مراد بوائے فرینڈ تھا۔

"ماما۔ وہ پہلے ہی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے غمگین تھی۔ اوپر سے اتنے عجیب و غریب انکشافات۔" آئیں یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا۔ بخار ہے مجھے۔

"ہاں بیٹی رنگ سفید پڑا ہوا ہے۔ بیٹھ جاتے ہیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔" دونوں پندرہ مرہک کے اوپر چڑھ کر گھاس پر بیٹھ گئیں۔ دھنک نے قرعہ درخت سے پشت نکالی۔

پھر ملانے اسے شروع سے لیکر آج تک کی ساری باتیں بتا ڈالیں۔ اور یہ بھی کہ فخر عالم کے صبح کرنے کے باوجود وہ جگ جگ اسے چھپ چھپ کر مومڑتی رہیں۔

"فخر عالم کہتا تھا تم اس سے بات کرنے سے کتراتے تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ اس سے ملو۔ سو وہ بھی اب تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ ایک دو بار میں نے دبے لفظوں میں تمہارا پتہ فون نمبر وغیرہ پوچھا بھی مگر تمہیں اسکا غصہ معلوم ہے۔ پھر میں اپنے چھل چھپیں اور اور مومڑتی رہی۔ اور بیٹی! یہ کامران سے تمہاری منگنی کا کیا قصہ ہے؟" ماما کو جیسے اچانک خیال آیا۔ "ایک رات فخر عالم بیگم جھاگیر کے یہاں ڈنر سے واپس آیا تو جیسے پاگل ہو رہا تھا اسے۔ آتے ہی کامران کو فون کیا۔ برس پڑا اس پر۔ گالیاں تک دے اٹکیں۔ بعد میں اس پکارے نے مجھے فون پر کہا۔ کہ اتے کیا معلوم تھا کہ فخر عالم اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ ورنہ وہ کیوں اسکا رشتہ مانگتا۔۔۔"

دھنک میرے سے مسکرائی۔ تو اسکا اندازہ کج نکلا تھا!

"پہچانی تاتم کیوں فخر عالم سے۔ اور چلی گئی تھیں؟"

”چلو بنی تمہیں پہنچا آؤں۔ جھک گئی ہو۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

”ہاں ماما چلوں گی اب۔ شاہ پھر سے بخار چڑھنے لگا ہے۔“ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
ماما نے اسے قریب ہی اسکے گھر چھوڑا اور خود کچھ مطمئن مطمئن سی خوش خوش چل دیں۔

گرم گرم دودھ میں اوڈلین ڈال کر اس نے پیا۔ اپنی دو اینیاں لیں اور بستر میں گھس گئی۔
سونے کی کوشش کی مگر نیند کہاں؟

ماما کی باتیں ایک ایک کر کے اسکے ذہن میں گونجی رہیں۔

’بنی۔ فخر عالم بہت اکیلا ہے۔ اسے اپنا لو۔ اسکے دکھ بانٹ لو۔

’اگر تم نے اسے سنبھالا نہ دیا تو وہ بکھر جائیگا اتنا میں بتا دوں۔

پھر چند روز قبل پنک پر فخر عالم کا وہاں سے گزرنا یاد آیا۔

اسے دیکھ کر جیسے وہ بے قرار سا ہوا تھا۔ پرکشش چہرے پر سائے سے لہرائے تھے۔

آنکھیں گھائیل سی لگنے لگی تھیں۔ اور پھر۔

جیسے بے قراری کی جگہ فصر نے لے لی تھی، پرکشش سایوں کی جگہ بھاری نظر آنے لگی

تھی اور گھائیل آنکھوں میں وحشت مہماکنے لگی تھی۔

اس نے تب بھی اندازہ لگایا تھا جیسے وہ اب بھی اسے چاہتا تھا مگر حالات پر قابو نہ

ہونے کی وجہ سے اس پر فصر آ رہا تھا، بہت زیادہ!

وہ ہولے سے مسکرا دی۔

شام کی چائے کے بعد وہ تیار ہوئی۔ آف و اسیٹ پر چھوٹے چھوٹے سبز پھولوں والے

کپڑے پہنے۔ آف و اسیٹ خوبصورت لٹلی سویٹر اور اسی کے مہرنگ لیڈر کے شوز پہنے۔ لاسیٹ

براؤن خوبصورت بالوں پر برش کیا۔ کپڑوں پر اپنا پسندیدہ ہلکون سپرے کیا۔ اور باہر نکل آئی۔

سب برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

”آن آپ لوگوں کا بیچہ جانے کا کوئی پروگرام نہیں؟“ اس نے پوچھ ہی لیا۔ وہ تینوں

ہمارے درمیان نہ آئیں تو کب کی ہماری شادی ہو چکی ہوتی۔ تم فخر عالم کی دولت کے پیچھے
لگی ہو۔ جلد ہی ہماری شادی ہو نوالی ہے...“

پھر اسی شام ایک بار پھر فخر عالم صاحب کا فون آیا۔ پتہ نہیں کیوں انکی باتوں سے مجھے لگا وہ
بھی آخری فیصلہ کرنا چاہتے تھے جیسے۔ رسم پوری کرنا چاہتے تھے محض!

واپس آئی تو اپنے کویک نے بھی بتایا کہ فخر عالم صاحب نے اپنی کزن سے شادی کر لی
ہے۔

بعد میں فخر عالم صاحب اکثر و بیشتر نظر آئے۔ اکا دکا بات بھی ہوئی۔ وہ اکثر غصے

میں ہوتے۔ مجھے حیرت بھی ہوتی کہ اب تو انکی شادی ہو چکی تھی انہیں خوش و خرم ہونا چاہیے

تھا بجائے اس کے کہ مجھ پر برس پڑتے۔ ”وہ قدرے رکی دم لیا۔“ پھر ہمیشہ اکیلے ہوتے۔ یہ

بھی عجیب لگتا۔ مگر یہ سٹنگ کی ایک نمائش پر ان کیساتھ بیگم جہانگیر کی باتوں سے پتہ چلا فریوہ

ہمہرک میں ہے۔ خیال آیا شادی کے بعد گئی ہے...“

دیر تک وہ اور ماما باتیں کرتی رہیں۔ ہر بات ششے کی طرح صاف اور واضح ہوتی چلی

گئی۔ دھنگ کی ساری غلطیاں ایک ایک کر کے دور ہوتی گئیں۔

”تھو بنی اب تو کسی نواب کی بیگم نے پھانس رکھا ہے۔ فون پر فون آتے ہیں۔ بہانے

بہانے کبھی گھر داتی ہے۔ کبھی خود چلی آتی ہے۔“

دھنگ دھیرے سے مسکرا دی۔

”اے بنی تم مسکرا رہی ہو۔ میں تو کہتی ہوں مارڈالوں اس کینت کو بھی۔“ وہ پھر سے

جھال میں آ گئیں۔

”تو نہ سنا کریں فون نہ جلیا کریں۔ اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ تو انکی پر مرضی ہے نا۔“

انکی مرضی پر تم بھروسہ نہ کیا اگر تم نے اسے سنبھالا نہ دیا تو وہ بکھر جائیگا اتنا میں بتا دوں۔“

ایک بار پھر وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اسے شاہ وہ بارہ نمبر پک نے آیا تھا۔ غناہت

سے آنکھیں بند کرنے سے پہلے وہ اسے لہکا لہکا۔

کاہل آج بھی پرکشش دکھائی دے رہا تھا اور۔۔۔ جمونیز نما عمل میں سے چمن چمن تگرتا تھی
مدم روشنیاں آج بھی پراسرار لگ رہی تھیں!
پاس پہنچ کر وہ رک گئی۔ ارد گرد دیکھنے لگی۔
تجھی۔ ایک طرف سے ماما آگئیں۔

”تم آگئیں بیٹا“۔ ماما خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

”ہاں ماما“۔

”اندراؤ۔ فخر عالم اپنے بیڈروم میں ہے۔“

”جی“۔

وہ ماما کیساتھ ہوئی۔

”میں نے اسے تمہارے بارے میں سب بتا دیا ہے۔“ ماما پتے پتے بولیں۔

وہ خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔

بڑے سے ہال میں سے ہوتیں وہ دونوں خوبصورت کارپنڈ بیڈروم چمکتے تھیں۔

فخر عالم کے بیڈروم تک۔ لہا کر ماما واپس مڑنے لگیں۔

”ماما...“ دھنک پھلی ہار جھجک سی رہی تھی۔

”جاؤ بیٹی جاؤ“۔ ماما آہستہ سے بولیں اور۔

بیڈروم کی طرف بڑھ گئیں۔

دھنک نے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔

”یس“۔

وہ دھڑکتے دل کیساتھ اندر داخل ہوئی۔

Luxurious اور آرام دہ کمرے میں Love seat پر بیٹا فخر عالم کوئی کتاب

پڑھنے میں منہمک تھا۔

آہٹ پر چونکتے ہوئے اس نے کتاب آگے سے ہٹالی۔

جو بہت اطمینان سے بیٹھے تھے۔
”ہاں بیٹے۔ اس وقت امت نہیں ہے۔“ امی بولیں۔ ”تمہیں بھی تو بخار تھا...“
”اس وقت نہیں ہے امی“۔ اس نے جموٹ کا سہارا لیا۔ کہ امی اسے بخار میں ہرگز ہاہر
جانے نہ دیتیں۔

”امی میں ذرا اپنی ایک دوست کے پاس جاؤں گی۔“ یس پاس ہی رہتی ہے۔“ اگر وہ
پہلے مل کا ذکر کرتی تو پھر بھی وہ جانے نہ دیتیں۔

”ہو آؤ بیٹا۔ طبیعت بہل جائے گی مگر... تمہارا بخار ابھی ٹوٹا نہیں ہے...“ وہ اسکے
کمزور سے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے متذہب سی بولیں۔

”امی کل واپس جاؤں گی۔ تو ڈاکٹر کو دکھا دوں گی۔ اس وقت میرا جانا ضروری ہے۔ پلیز
امی؟“ وہ امی کے پاس ہی کھڑی تھی۔ محبت سے اسکے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔

”جاؤ بیٹا۔ مگر جلدی آنے کی کوشش کرنا مجھے فکر لگی رہے گی۔“

”کوشش ضرور کروں گی امی۔ لیکن... اگر دیر ہوگئی تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں...“
دیر تو ہونامی تھی۔ بس سے جانا۔ کچھ دیر وہاں رہنا اور پھر واپس!

بس سے اترتے ہوئے وہ شورٹ کٹ پر ہوئی۔

جلدی ہی اس جگہ پہنچی تھی۔ جہاں دریا کی چوڑائی کم اور بڑے بڑے پتھر ہوتے تھے۔

اور جہاں سے وہ پہلے بھی کسی دریا کر اس کر چکی تھی۔

شام نہال ہو رہی تھی۔ اونچے اونچے سر بلنگ پائیز میں ڈھیر سارے سفید ہادل آنکھ

بلائی کیل رہے تھے اور جنگل کے چھ میس سے گزرتی بل کھاتی ہنگل روڈ کے دونوں طرف

ہیٹارڈنگ لائٹس گہرے گہرے ماسے کی ہنگل نشاندہی کر رہے تھے۔

وہ آگے آگے بڑھتی گئی۔

جہاں گھنٹا گھنٹا بھی بوس کھڑے نظر آ رہے تھے۔ گھر کے آگے بنا پھونسا کلائی

READING
Section

پھر بھی۔ وہ اسے سیٹ پر لے آیا۔ آہستہ سے لٹا دیا۔ کٹن سر کے نیچے دیئے۔ اور کبیل اوزھا دیا۔

”میں تو خود تمہارے پاس آ رہا تھا۔ مگر تم نے پہل کی ہے مجھے اور بھی اچھا لگا۔“ وہ انٹر کوم کار بیسور اٹھاتے اٹھاتے خوشگوار سے بولا۔

اس نے کچن میں کوئی آرڈر کی۔ اور واپس آ کر اسکے پہلو میں بیٹھ گیا۔

ایک ہل کو اسکی خوبصورت آنکھوں میں مہانٹا۔

پتہ نہیں کیا تھا اسکی آنکھوں میں؟ دھنک کی پلکیں جھک گئیں۔ چہرے پر حیا کی لالی بکھر گئی۔

فخر عالم بہت مملوٹ ہوا۔ آج وہ ایک پریس رپورٹر سے عام لڑکی بن گئی تھی!

”بائے دادے کل تم واپس نہیں جا رہے۔ اسے معلوم تھا کل اس نے ڈیوٹی پر جانا تھا۔“

”کیوں؟“ وہ پھر سب بھول بھال گئی۔ نظریں اٹھا کر اسکی طرف دیکھنے لگی۔

”اسلئے نہیں۔ کہ آج رات میں اور ماما تمہارا ہاتھ مانگتے تمہارے پیرس کے پاس

جا بیٹھے۔ کل انشاء اللہ ہمارا نکاح ہوگا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے آؤنگا۔ اور جب تم

بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تو ہم ایک شاندار ولیمر دینگے۔ اور یوں ہماری شادی ہو جائیگی...“

اسکا چہرہ ایک بار پھر سرخ ہو گیا۔

”اور یہ سارا پروگرام آپ نے خود ہی بنا لیا۔“ وہ سنہلے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ مجھے کون روک سکتا ہے۔“

”اور... میں...“

معاذ روزے پردستک ہوئی۔ اور دھنک کی بات اور صوری رہ گئی۔

فخر عالم اسکے پاس سے اٹھتے ہوئے بالکونی کے قریب رکھی حیر لاکرا اسکے نزدیک بیٹھ گیا۔

قوم کوئی کیڑے لئے اٹھ آ گیا۔ برتن اگلے قریب میز پر رکھے اور واپس چلے آیا۔

دھنک اٹھ کر بیٹھ گئی۔

دھنک اب بھی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔

ایک لو کو فخر عالم کی آنکھوں میں قد بلیس سی جل اٹھیں۔ مگر دوسرے ہی ہل نارنگی ہو کر

آئی۔ کیسے بغیر کھمتائے اسے چھوڑ گئی تھی۔ کتنا کتنا پریشان رہا تھا وہ۔

دھنک کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ماما کہ اس نے غلط کیا تھا مگر اب تو آگئی تھی! آ!

کوئی رسپانس نہ پا کر وہ موتی لڑھک کر اسکے خوبصورت گالوں پر آ رہے۔

اور اٹھتے ہوئے فخر عالم نے اپنے دونوں بازو اکر دیئے۔ وہ اسکے آنسو نہیں دیکھ سکتا

تھا۔

حسی حسی ہی وہ آگے بڑھی۔ فخر عالم نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ سینے سے لگا

کر چہرے قرار آنے لگا۔

”کہیں جلی گئی تھیں مجھے چھوڑ کر ہاں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گا۔“

اسکے مہکتے ہالوں میں چہرہ چھپائے وہ دیر دیر سے کہتا گیا۔ ”اب میں ایک ہل بھی تمہیں

اپنے سے الگ نہیں کرونگا۔ چھوڑ جاتی ہو، مگر ہو جاتی ہو، چھتی زہریلی باتیں کرتی ہو...“

دھنک رو رہی تھی۔ پچھلیاں لے لٹکر رو رہی تھی۔ بہت دکھ اٹھانے کے بعد آج اسکا کندھا

طاقتا سر رکھے کوشا پدا سلئے۔

”روؤ نہیں پلیز!“ اس نے اسکا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ”اب تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔“ اس

نے اٹھتے آنا اپنے ہونٹوں پر اٹھالئے۔

م۔ چوٹا۔

”تمہیں تو اب بھی نہیں چہ ہے۔ آرام کی ضرورت ہے تمہیں۔“

اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر وہ بینڈ کی طرف چلا۔

”یہاں پلیز!“ دھنک نے قریب ہی لائٹ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سکر لویا۔

”اب تم آرام سے لیٹ نہیں سکو گی؟“ صرف دو بندوں کی تو سیٹ تھی۔

READING
Section

”جسہیں کیا ہوا؟“ وہ جان بوجھ کر پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں۔ اور میں نے آپ سے شادی نہیں کرنی۔“

”ک۔ کیوں؟“

”آج آپکی بیگم جہانگیر ہیں۔ کل کوئی اور ہوگی...“ اس کے لہجے میں شکوہ تھا، حکایت تھی۔

”میری آج بھی تم ہو اور کل بھی تم ہوگی۔ بیگم جہانگیر کہاں سے آئیں۔“

”آپ لائے ہیں۔ مجھے کیا پتہ۔“

”Let's don't discuss her.“ بلکہ آج کسی اور کی بات نہیں ہوگی۔ صرف

میری اور تمہاری بات ہوگی۔ ٹھیک۔“

”ہاں۔“ دھنک نے مصدومیت سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ ”آئینہ وہ بھی صرف میری

اور آپکی بات ہوگی۔ کسی اور کی نہیں ہوگی۔“

”آئینہ وہ کی تو میں گارنٹی نہیں دے سکتا...“

”کیا؟“ وہ تیز ہونے لگی۔

”بھئی آئینہ وہ ہم اپنے بچوں کی تو باتیں کر چکے؟۔ میں کیسے وعدہ کروں کہ آئینہ وہ بھی

صرف میری اور تمہاری بات ہوگی۔“

اس کا چہرہ کانوں کی لوڑوں تک سرخ ہو گیا۔

دھنک نے کوئی کا آخری گھونٹ لیا۔ اپنا کپ میز پر رکھا۔

”اب میں چلوں گی۔ کچھ کچھ بہت دیر ہو جائیگی۔“

”ہاں۔ اس وقت میں تمہیں اور نہیں روکوں گا۔ کیونکہ تمہارے گھر میں کوئی اطلاع نہیں

لیکن اتنا رک جاؤ کہ میں اور ماما بھی تمہارے ساتھ چلیں۔ جسہیں چھوڑنے بھی جانا

ہے۔ اور جسہیں ہیو۔ کیلئے ساتھ لانے کی بات بھی کرنی ہے تمہارے سوتھس سے...“

”آج ہی کر لیں گے بات۔“ دھنک جبک سی رہی تھی۔ اس کے جانے سے کہیں امی ابو

بکھڑے جانے سب۔

فخر عالم نے اسے سینڈویچز آفر کئے۔ پھر اس کیلئے کوئی بنانے لگا۔

”میں نے اس سے پہلے کبھی کسی لڑکی کیلئے کوئی نہیں بنائی۔ آج تمہارے لئے بنا رہا

ہوں...“

”چھوڑیں نا۔ بیگم جہانگیر کیلئے تو بنائی ہوگی۔“ دھنک نے لطیف چوٹ کی۔

وہ زور سے ہنس دیا۔

”میں لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ بات چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

دھنک کے حسین چہرے پر سایہ سالہرا گیا۔

”اس کا مطلب ہے بیگم جہانگیر کیلئے بناتے رہے ہیں۔“

”آں... Never ever۔۔۔ وہ میرے لئے بناتی تھیں البتہ۔“

دھنک کو یہ بھی اچھا نہیں لگا۔ چپ سی رو گئی۔

فخر عالم نے کپ اسکے آگے رکھا۔ پھر اپنے لئے کوئی بنائی۔ اور کڑوی بلیک کوئی کے گرم

گرم گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

”ہائے دلوے جسہیں اگلے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“

”اگلے یہاں ڈنر پر... پھر میسٹرز کی نمائش پر... پریس والے کہہ رہے تھے۔“ اس

نے پریس پینڈ اور دیتے ہوئے کہا۔ آصف پریس ہی سے تو تھا۔

”لوہو۔“

”لوہیں۔“

”اب کیا ہوگا؟“ اس نے اپنے لوہ پر مصنوعی گھبراہٹ طاری کر لی۔

اور دھنک کھٹکھٹا کر ہنس دی۔

”بہت اچھی کوئی بناتی ہیں دیے... بیگم جہانگیر...“ فخر عالم نے ایک بار پھر اسے

بھلا۔

مسکراتی دھنک خاموش ہو گئی۔

"آپکا انٹرویو لیٹا تھا سر!"

اور۔۔۔ فخر عالم کا جاندار تھو بندہ ہوا۔

"Yes, but no details. Just three words..."

"کیا؟"

"Fakhr e Alam — The murderer, the drunkard and the ultimate womaniser."

اور۔۔۔ دھنک کو بہت پہلے ایڈیٹر اشفاق کو فخر عالم کے ہی گھر سے لکھا اپنا خط یاد آ گیا۔ یہی سب تو لکھا تھا اس نے اس میں۔

وہ خفیف سی نظر آنے لگی۔

"آپ... معاف نہیں کر سکتے مجھے۔"

"معافی کیسی۔ یہی سب کرتے ہوئے تو تم مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔" ہاتھ جوھا کر اس نے اسے اپنے پیلو سے لگا لیا۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کتنا اچھا تھا وہ!

"اور ہاں۔" اس نے اس کے چہرے پر گھر آئی بالوں کی لٹ آہستہ سے انگلی سے پیچھے ہٹائی۔ "مگر یہ انٹرویو میگزین کیلئے تمہاری آخری سائیکسٹ ہوگی۔ اب میں تمہیں ایک ٹپا کو

بھی اپنے سے الگ نہیں کرونگا۔ سمجھیں..."

"جی۔" اس نے سر آہستہ سے اثبات میں ہلا دیا۔

اور چند ہی روز بعد چیف ایڈیٹر اشفاق اور آصف آفس میں بیٹھا اپنے اپنے ایسے کارڈ

وصول کر کے مسکرا رہے تھے۔

اشفاق صاحب کے نام ایک الگ رجسٹری بھی تھی۔ اس میں حفاظت سے تہ کے چند

اوراقی کیساتھ دھنگ کا ایک ٹکڑا سا خط بھی تھا!

"Don't you worry." ہم تمہیں گھر ہے کچھ قاصدے پر ڈراپ کر دیں گے۔ جب

تم گھر کے اندر چلی جاؤ گی تو ہم بھی آ جائیں گے... "وہ بہت سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو کر بولی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" فخر عالم نے اسکی کاپی کی۔ "یہ کوئی بچوں کی Hide and seek

گیم تو نہیں ہے کہ پہلے تم اندر جاؤ پھر ہم آ جائیں گے۔ سیدھے سیدھے ایک ساتھ چلیں

گے۔ رات ہے اندھیرا ہے۔ ہاں تم اپنا میرے پاس آنا چھپانا چاہو وہ الگ بات ہے۔ وہ تم خود سوچ کر کیا کہو گی۔ جب تک میں تیار ہو کر آتا ہوں۔"

اسے وہیں چھوڑ کر وہ اپنے ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔

اور وہ واقعی سوچنے لگی۔ وہ کہے گی۔ کہ وہ وہاں آ کر بس سے اتری تو یہ لوگ اس طرف

آتے ہوئے راستے میں مل گئے۔ اور اسے لفت دیدی۔

تھوڑی سی دیر میں فخر عالم تیار ہو کر آ گیا۔ سیاہ قیمتی سوٹ میں بلبوس وہ ہمیشہ کی طرح

Stunning لگ رہا تھا۔

اس نے وہیں سے ملنا کو بھی تیار ہونے کا کہہ دیا۔ خود آ کر دھنگ کے پاس صوفے پر

بیٹھ گیا۔

ایک لمحے کو اسکی آنکھوں میں دیکھا۔

"ہائے واوے مس اتہارا یہاں نزول کیسے ہوا؟ کہاں سے آئیں؟ کس سلسلے میں

آئیں؟" وہ اپنی بہت پہلے کی بات دہراتے ہوئے مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

وہ ہنس دی۔ خواہ سورتی سے۔

"بڑی چٹھی خیال آیا؟" اس نے بھی اپنا پرانا ہی جواب دہرایا۔

"پلاور سے کئی تاروں۔ کیوں آئی تھیں؟ کیسے آئی تھیں... " اسکی آنکھوں میں اس

وقت بھی حیرت سی ہنک تھی جسے کئی بات کہنے ہوئے بہت پہلے تھی۔

وہ مسکرائی۔ ایک ٹپا کو کچھ سا چا۔



”انگل میں نے کہا تھا مسز فخر عالم کا اعتراف میں کر دوں گی۔ سو حاضر خدمت ہے۔ آپ من کر یقیناً خوش ہو گئے۔ میں نے آپ کا کہا مان لیا۔ جہول آپ کے اپنا گھر سا لیا اور جان جو کھوں کے کام چھوڑ دئے۔ دمک۔“

”آپ... آپ... آپ... مجھ سے شادی کر چکے؟“

وہ اپنے فرسٹ کلاس کپارٹمنٹ میں سے نکل کر پتلی سی میگ وے میں سے گزری رہا تھا کسا ایک لڑکی نے روک لیا۔

”کیا؟“ وہ جیسا مچل کر رہ گیا!

”کاروان کیا تھا ایک چٹا بھرتا مسین آرمادہ سنکل بیٹا پارٹمنٹ تھا؟“

”آپ نماز بھی پڑھتے ہیں اور کئی کئی گرل فرینڈز بھی پالتے ہیں...“

”In namaz, I bow before my Creator. And in a girl friend I admire His creation.“

وہ لوگ چلے ہی چلے گئے۔ قصبے اور شہر آتے اور پیچھے رہ جاتے مگر ان کا سفر جاری تھا۔ شیر شاہ کاروان ڈرائیج کرتا سڑک پر نظریں جمائے تھا۔ ”سنگرز سینٹ پر بیٹھا اسٹاس سے گپ شپ کر رہا تھا۔ جس دنوں کو کوئی کی طلب ہوئی۔“

”لٹی پلیز! ہمارے لئے کوئی گاڑی۔“ اسد نے ریش پیچھے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ لٹی نے مختصر سے ٹو بھورت مگن میں کوئی گاڑی۔ کچھ گھس میں ڈالی۔ مہولی ت۔ اسے میں گھس ساتھ میں سینڈ وچر رکھے اور۔ فرنٹ سٹس کی طرف چلی آئی۔

”This is the city of the richest celebrities.“ شیر شاہ نے اسد سے کہا۔

”ویسے فطرت کرنا اچھا نہیں ہوتا۔“ لٹی بولی۔

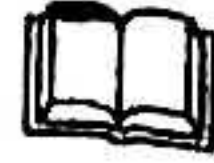
”کون کا فطرت کرتا ہے۔“

”تو پھر ایک وقت میں تین تین کیسے ہوتی ہیں؟“

”مجھے تینوں اچھی لگتی ہیں۔“

بے حد مہذب و بزرگ سی سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ جیسے گوہر ایسی کھنکھو خواب تھی اور اسکے جاگ جانے کا اندیشہ تھا۔ آزار میں لے رہے تھے کہ وہ اعم دولی ہوئی تو جان سے ہانپ گئے!

اُس کا گھر آستانہ قہل احمد کی مندر طرف طرز تعمیر میں ایک اور خوبصورت اضافہ ہے۔



○ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھوڑے پر سوار ہوا، اسے ایڑھ لگائی، تیزی سے مختصر سی چڑھائی طے کی اور اس پار اترتے اترتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

○ وہ اسے کسی دیو مالائی کہانی کا شہزادہ لگا۔ خوبصورت، بے خوف اور بہادر!

○ مگر... وہ شاہ تھا باز نہیں تھا۔ اس نے تلخی سے سوچا کہ وہ جی تو رہا تھا مگر آنکھوں میں وہ بے باکی نہ رہی تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی اور جو ایک باز کی خصوصیت تھی!

○ اس وقت پھر شانی کو محسوس ہوا نا دیہ اسے فاتحانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ شہباز خان سے ملنا... ایک پر جلال، بختیا رکھ جہاں پناہ سے ملنا! ایک دنیا فتح کرنے کے مترادف ہی تو تھا!

○ ”آپ میں ہی تو وہ سب کچھ ہے جسکی لڑکی تمنا کر سکتی ہے...“

○ ”No, No, Please!“ وہ اچانک ہسٹیرک انداز میں کہنے لگا۔ ”میں وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔ تم... کچھ نہیں جانتیں میرے بارے میں...“

○ نا دیہ کو سویت پر چھوڑتے چھوڑتے وہ ایک بار پھر چونکا۔

○ بتیاں تو سب روشن تھیں، یہ سویت آج اتنا بے رونق کیوں تھا؟

○ دنوں بعد ایک موہومی مسکراہٹ اسکے لبوں کو چھو گئی۔ پڑوسن کے نقوش ہوٹیل پر خاصے گہرے تھے!

آمنہ اقبال احمد اپنی مخصوص طرز تحریر میں ایک اور ناول پڑوسن پیش کرتی ہیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✦ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



آمنہ اقبال احمد

کے

قلم سے نکلا ہوا

لازوال ناول

آمنہ اقبال احمد

کے

دیگر ناول

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

بہار

دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھوڑے پر سوار ہوا، اسے پہلا لکائی، تیزی سے مختصری
پڑھنے والی لکھی اور اس پار اترتے اترتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ اسے کسی اور مالائی کیانی کا شہر اور ملک، خوبصورت بے خوف اور بہادر
شہر... وہ شہر تھا ہارنٹن تھا، اس کے پاس سے لیا کہ وہ جی تو رہا ہے مگر اس کی
آنکھوں میں بے باک تڑپ ہی تھی جو کسی ہوا کرتی تھی اور ایک بار کی خصوصیت ہوتی ہے۔
اس وقت پھر شہر کی کوئی اور جیسے ہاویہ سے فائنٹ انداز میں کھڑکی ہو۔
شہر کے گلیوں سے ملنا... ایک پر جلال و عظمت، جہاں بناو سے سنا اس دنیا کو
مخبر کرنے کے مترادف ہی تھا۔

”آپ میں تو وہ سب کچھ ہے جس کی ایک لڑکی تمنا کر سکتی ہے“
”No, No, Please!“ وہ اچانک سنجیدگی انداز میں کہنے لگا
میں وہ نہیں جو نظر آتا ہوں۔ تم... کچھ نہیں جانتے میرے بارے میں۔
نازیہ کو سوٹ پر چھوڑتے چھوڑتے وہ ایک بار پھر چونکا۔
بتیاں تو سب روشن نہیں مگر جانے یہ سوٹ آج اتنے رونق کیوں تھا؟
دونوں بعد ایک مہوہومی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ پراون کے نقوش
ہونٹ پر خاصے گہرے تھے

شائع ہو گیا ہے

نئی اور یاد رفت اس پہ پراون کریں

اشاکھٹ

ناشر

Ph: 722218, 721783
Fax: 721084
Mob: 9991-4571442

طیور پبلشرز

ارسلان بکس کارپوریشن

READING Section